علّامہ اقبالؒ کے زرعی نظریات

——— مظفر حسین

زیرِ نظر مضمون اس سے پہلے ۱۹۷۰-۷۱ء میں ہفت روزہ "زندگی" میں قسط وار چھپ چکا ہے۔ احباب کا تقاضا تھا کہ اسے الگ کتابی شکل میں شائع کیا جائے مگر ضخامت کم ہونے کی وجہ سے کتابی صورت میں اشاعت مناسب معلوم نہ ہوئی۔ اس لئے اسے یہاں معمولی حک و اضافہ کے ساتھ ایک ہی مضمون کے طور پر شائع کیا جاتا ہے۔

بعض مقامات پر بحث طویل ہو گئی ہے بلکہ موضوع سے بھی ہٹی ہوئی معلوم ہو گی لیکن چونکہ راقم نے علّامہ اقبال کے خیالات کا جائزہ لینے کے سلسلے میں علمی سے زیادہ عملی اور اطلاقی نقطہ نظر اختیار کیا ہے اس لئے اُمید ہے کہ تحریر کا یہ عیب گوارا کر لیا جائے گا۔

(مدیر)

علّامہ اقبالؒ کے زرعی نظریات

زراعت سے اقبال کی دلچسپی

انسانی تاریخ کے اوّلین ادوار سے لے کر آج تک زراعت کو ایک بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے کیونکہ انسانی زندگی کی بقا کا انحصار ہی زراعت پر ہے۔ کرۂ ارض پہ جتنی تہذیبیں بھی پروان چڑھیں ان سب کے پیچھے زراعت کی پشت پناہی کارفرما رہی اور انسانی زندگی کے دوسرے شعبوں کے ساتھ اس کا گہرا تعلق رہا۔ اقبال اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ " مابعد الطبیعاتی فلسفے کا ارتقاء" میں اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایران میں زرتشت کے مذہب کی جڑیں زراعت میں استوار تھیں اور یہیں سے اس مذہب کو نشو و نما ملی۔ انسانی زندگی میں زراعت کی اہمیت کے پیش نظر اقبال زندگی بھر زراعت اور کاشت کار کے حالات کو بہتر بنانے کے مؤید رہے۔ چنانچہ ان کی اوّلین تصنیف "علم الاقتصاد" سے لیکر ان کے آخری مجموعۂ کلام " ارمغانِ حجاز" تک زراعت اور کاشت کار کے موضوع پر ان کے بے شمار بصیرت افروز خیالات ملتے ہیں۔ پھر چونکہ برصغیر ہندو پاکستان کے مسلمانوں کی غالب اکثریت شروع ہی سے زراعت کے پیشے سے وابستہ تھی اس لئے ممکن نہ تھا کہ کوئی مفکر اس خطے کے لوگوں کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی اصطلاح کا کوئی خیال یا اس خیال کو عملی جامہ پہنانے۔ سے بالواسطہ طور پر مرتب ہونے والا تہذیبی و ثقافتی اور اخلاقی ترقی کا کوئی نقشہ زیرِ غور لاتا اور اس میں کاشت کار کے احوال کی اصلاح کو بنیادی اہمیت نہ دی جاتی۔ چنانچہ حکیم الامت علامہ اقبال کی اسلامیانِ پنجاب کے اس اکثریتی طبقے کے عملی مسائل سے دلچسپی

ایک فطری امر تھی۔ مارچ ۱۹۳۲ء میں لاہور میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے صدارتی خطبہ میں آپ نے کاشت کار آبادی کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے فرمایا تھا:۔

"برصغیر پاک و ہند میں اسلام کے مستقبل کا بڑی حد تک انحصار مسلم کاشت کار کی آزادی پر ہے۔ آتش شباب (نوجوان) اور سوزِ یقین (کسان) کا امتزاج ہونے دیجیئے، اس سے زندگی کا شعلہ پوری تابانی سے فروزاں ہوگا اور آنے والی نسلوں کے لئے ایک نئی دنیا تخلیق ہوگی۔"

اس تقریر میں آپ نے تجویز پیش کی کہ نوجوانوں کی ایسی جماعتیں اور رضاکار دستے قائم کئے جائیں جو اپنی تمام کوشش خدمت خلق اور دیہات کی اقتصادی و سماجی اصلاح کے لئے وقف کریں۔ کاشت کاروں سے قرضوں کا بوجھ اتاریں اور ان کی اقتصادی مشکلات دور کرنے میں مدد دیں اور ساہوکار آڑھتی اور نام نہاد پیروں کی چیرہ دستیوں سے نجات دلائیں۔

دہقان ـــــ تصویرِ مظلومیت

کاشت کاروں کی زندگی کے گوناگوں مسائل ہمیشہ علامہ اقبال کی سوچ بچار کا ایک اہم موضوع بنے رہے اور ان میں ان کی گہری ذاتی دلچسپی کا یہ عالم رہا کہ آپ کے آخری مجموعہ کلام" ارمغانِ حجاز" میں یہ اشعار ملتے ہیں۔

دہقاں ہے کسی قبر کا اگلا ہُوا مردہ
بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیرِ زمین ہے
جاں بھی گروِ غیر بدن بھی گروِ غیر
افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے، نہ مکیں ہے

اقبال کے نزدیک دہقان کی زندگی موت سے بدتر ہے" خفتگانِ خاک" سے ان کا یہ استفسار کہ مرنے کے بعد بھی دہقان کو چین نصیب ہوتا ہے کہ نہیں؟ دہقان کو غربت و افلاس کی ایک علامت بنا دیتا ہے۔

اس جہاں میں اک معیشت اور سو افتاد ہے
روح کیا اُس دیس میں اس فکر سے آزاد ہے؟
کیا وہاں بجلی بھی ہے ! دہقاں بھی ہے خرمن بھی ہے؟
قافلے والے بھی ہیں؟ اندیشۂ رہزن بھی ہے؟

کاشت کار کی معاشی ابتری اور معاشرتی زبوں حالی کا جو نقشہ ان دردانگیز الفاظ میں کھینچا گیا ہے اس سے کاشت کار کی محکومی و مظلومی پر ان کے دلی کرب کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔ اس طرح جب وہ محکوم و مجبور و فقیر "کشمیر کی تصویر کشی کرتے ہوئے اس میں بے دردیٔ ایام کی داستان سمونا چاہتے ہیں تو اس کے لئے بھی ان کی چشم تصور غیر شعوری طور پر کسی دہقان پیر ہی کے غم خانہ پر جا رکتی ہے۔

سینۂ افلاک سے اٹھتی ہے آہِ سوزناک　　مردِ حق ہوتا ہے جب مرعوبِ سلطان و امیر
کہہ رہا ہے داستان بے دردیٔ ایام کی　　کوہ کے دامن میں وہ غم خانۂ دہقانِ پیر

عالم بالا میں اپنے خیالی سفر کے دوران میں بھی علامہ اقبال کی نظریں سینۂ ارض کو چیر کر لعل و گہر پیدا کرنے والے دہقان کو ڈھونڈ نکالتی ہیں اور اس کو آسودہ حال دیکھ کر ان کو طمانیت پہنچتی ہے۔ چنانچہ "جاوید نامہ" میں مریخ کے شہر مرغدین کی سیر کے بیان میں لکھتے ہیں :۔

سخت کش دہقان چراغش روشن است　　از نہاب دہ خدایان ایمن است
کشت و کاوش بے نزاعِ آبجوست　　حاصلش بے شوکتِ غیرے از وست

غرض جہاں کہیں بھی کاشتکار کی غربت و افلاس کا ذکر ہے علامہ اقبال انتہائی جذباتی انداز میں اسے بیان کرتے ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کاشت کار کی مظلومیت اور مفلوک الحالی سے شدید متاثر تھے اور اس کے ازالہ کے لئے سخت مضطرب اور بے چین۔ بسا اوقات اس ضمن میں ان کا لب و لہجہ انتہا پسندی کی اس حد تک انقلابی بلکہ باغیانہ ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے غم و غصے کے اظہار کے لئے اس طرح کے تند و تیز اشعار سے کم پر مطمئن نہیں ہو پاتے۔

خدا آں ملتے را سروری داد　　کہ تقدیرش بدستِ خویش بنوشت
بہ آں ملت سروکارے ندارد　　کہ دہقانش برائے دیگراں کشت

حاصلِ آئین و دستورِ ملوک
دہ خدایان فربہ و دہقان چو دوک

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعل ناب
از جفائے دہ خدایان کشتِ دہقاناں خراب
انقلاب انقلاب
اے انقلاب

جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

ترقئ دیہات کی تجاویز

یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ مزارعین کی مظلومیت کے خلاف جہاد میں علامہ اقبال نے محض شعر سے کام لے کر گفتار کا غازی بننے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ۲۸-۱۹۲۶ء میں جب وہ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے رکن تھے تو غریب کاشتکاروں کے مسائل حل کرنے کے لئے کردار کا غازی ہونے کا ثبوت بھی دیا۔ حکومت پنجاب نے منٹگمری (ساہیوال) میں نیلی بار کی تین لاکھ ستر ہزار ایکڑ اراضی متمول اور سرمایہ دار لوگوں کو فروخت کرنے کا فیصلہ کیا تو انہوں نے تحریک پیش کی کہ اس رقبے کا نصف حصہ مزارعین میں تقسیم کیا جائے۔ اسی طرح ۱۹۲۸ء میں اسمبلی کے اجلاس میں یہ تحریک پیش کی کہ جس شخص کے پاس پانچ بیگھے غیر آبپاشی زمین ہو اور پیداوار عملاً معین مقدار میں حاصل ہوتی ہو تو اس پر لگان نہ لگایا جائے۔ وہ ترقی دیہات کے ہمیشہ پرجوش مبلغ رہے اور دیہات میں زیادہ سے زیادہ طبی اور حفظان صحت کی سہولتیں بہم پہنچانے کی طرف حکومت کی توجہ دلاتے رہے۔ اس قسم کی تجاویز کو آج کل کی سیاسی جماعتیں شاید اپنی ترقی کا ثبوت دینے کے لئے اپنے منشورات میں جگہ دیتی ہیں جب کہ علامہ اقبال نے آج سے قریباً نصف صدی پیشتر ہی اس قسم کی اصلاحات کی ضرورت کو محسوس کر لیا تھا۔ چنانچہ جس جوش و خروش سے انہوں نے اس تحریک کو پیش کیا اس کا اندازہ اس تقریر کے مطالعہ سے لگایا جا سکتا ہے جو ۲۳ فروری ۱۹۲۸ء کو پنجاب اسمبلی کے ایوان میں کی گئی۔ اس تقریر میں ایوان کی توجہ اس شدید ناانصافی کی طرف دلائی گئی کہ جہاں کوئی شخص زمین کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے دو ہزار روپیہ سالانہ آمدنی تک ٹیکس سے مستثنیٰ ہے وہاں اس بات

کا آخر کیا جواز ہے کہ زمیندار خواہ چھوٹا ہو یا بڑا اور زمین سے اس کی آمدنی خواہ کتنی ہی کم ہو اسے لازماً لگان ادا کرنا پڑتا ہے۔ حضرت علامہ نے فرمایا کہ یہ نظام سراسر ناانصافی پر مبنی ہے۔ اس لئے یہ دلیل یہاں کوئی وقعت نہیں رکھتی کہ اسے ختم کرنے سے مشکلات پیدا ہوں گی۔ لہٰذا اسے برقرار رکھا جائے۔ اس کے برعکس ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہیئے کہ چونکہ یہ نظام سراسر انصاف کے منافی ہے اس لئے اس کا ازالہ کیا جانا ضروری ہے۔ اس ضمن میں آپ نے یہ دلیل دی کہ اس وقت صوبے میں اقتصادی ملکیت دس ایکڑ شمار ہوتی ہے اور پانچ بیگھے کی حد اقتصادی ملکیت کا نصف ہے۔ اس لئے پانچ بیگھے تک لگان معاف کر دینے سے محاصل میں خاص کمی واقع ہونے کا اندیشہ نہیں۔ ان دلائل کے علاوہ آپ نے یورپین مصنفین بالخصوص پیرون (PERRON) اور برگز (BRIGGS) کے حوالوں سے یہ دلچسپ اور اہم نکتہ بھی اٹھایا کہ ہندوستان کی پوری تاریخ میں کسی بھی حکومت نے زمین کے مالک ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔

مسئلہ ملکیتِ زمین

پنجاب میں انگریز کے قائم کردہ نظام جاگیرداری سے علامہ اقبال سخت بیزار تھے۔ ان کے نزدیک یہ نظام پنجاب میں ایک صحت مند معاشی اور معاشرتی ماحول کی تشکیل میں سدِ راہ بنا ہوا تھا۔ زمین کی پیداوار بڑھانے کے ضمن میں جاگیرداروں کی عدم دلچسپی کی وجہ سے ایک طرف تو پیداوار کم ہو رہی تھی جو روز افزوں آبادی کے پیشِ نظر ایک انسانی جرم تھا۔ دوسری طرف جیسا کہ "علم الاقتصاد" کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔ محض آبادی کے دباؤ کی وجہ سے زمین کا لگان بڑھ جانے کی وجہ سے ان کی دولت میں ہونے والا اضافہ بالواسطہ مزارعین کے استحصال پر منتج ہوتا تھا اور علامہ اقبال اس صریح ظلم کے خلاف سراپا احتجاج تھے۔ چنانچہ اس نظام جاگیرداری کی وجہ سے مزارعین کی روز افزوں غربت انہیں غیر انسانی سطح پر زندگی بسر کرنے پر مجبور کر رہی تھی اور خودی کی نشوونما کی طرف توجہ دینے کے بجائے وہ ساری زندگی جسم و جاں کے رشتے کو برقرار رکھنے کے لئے تج دیتے تھے۔

جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ علامہ اقبال کی تعلیمات کی غرض و غایت ہی افراد کی ذاتی خوبیوں کو پروان چڑھانا ہے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آپ معاشی ترقی کی رکاوٹوں کو محض اسی لئے ہی دُور نہیں کرنا چاہتے تھے کہ قوم کی دولتمندی میں اضافہ ہو یا کہ مادی اعتبار سے افرادِ قوم کا معیار زندگی بلند ہو بلکہ صرف اور صرف اس لئے کہ ان کے اندر

اعلیٰ و ارفع اخلاقی و روحانی اقدار کیلئے جدو جہد کی اُمنگ پیدا ہو اور ہر فرد کی خودی ترقی کرے اور یہ کہ ان کی تخلیقی صلاحیتیں محض معاشی مشکلات کی وجہ سے برباد ہو کر نہ رہ جائیں اور ان کی خودی کی نشوو نما رک نہ جائے۔ غرض معاشی مسائل سے آپ کی تمام دلچسپی اس اخلاقی اور روحانی نصب العین کے تابع تھی جو اسلام کا طرہ امتیاز ہے نہ کہ قومیانے NATIONALISATION یا اشتراکیت (SOCIALISM) کی غرض سے جس میں ہمہ گیر (TOTALITARION) معاشرے میں افراد کی ذاتی صلاحیتوں کو آزادانہ ابھرنے کا کوئی موقع ہی نہیں ملتا۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں علامہ فرماتے ہیں :-

"قوموں کی تقدیر اور ہستی کا دارو مدار اس امر پر نہیں کہ ان کا وجود کہاں تک منظم ہے بلکہ اس بات پر ہے کہ افراد کی ذاتی خوبیاں کیا ہیں اور قدرت اور صلاحیت کیا ہے۔ یوں بھی جب معاشرہ حد سے زیادہ منظم ہو جائے تو اس میں فرد کی ہستی سرے سے فنا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے گردوپیش کے اجتماعی افکار کی دولت سے تو مالا مال ہو جاتا ہے لیکن اپنی حقیقی روح کھو بیٹھتا ہے"۔

معیشت اور اخلاق کا رشتہ

اس ارشاد کی روشنی میں زمین کو قومی ملکیت میں لینے کا آخر کیا جواز باقی رہ جاتا ہے۔ درحقیقت ایک سچے مسلمان کی طرح علامہ اقبال کا معاشی مسائل پر غور و فکر کرنے کا انداز بھی یہ تھا کہ اسلام میں معیشت اور اخلاق باہمدگر مربوط اور ایک دوسرے پر انحصار رکھتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کی اس آیت" لن تنالو البر حتی تنفقو مما تحبون" (تم اس وقت تک نیکی حاصل نہیں کر سکتے جب تک اس چیز کا انفاق نہ کرو جو تمہیں محبوب ہے) کی تشریح ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے یوں کی ہے کہ فاعل اخلاق کا انفاق اس کے لئے اخلاقی فضیلت اور انفاق سے مستفید ہونے والے کے حق میں عمل معیشت ہے۔ اس لئے جب تک اخلاق اور معیشت باہمدگر مربوط نہ ہوں از روئے قرآن معاشرے میں اس کا عمل متصور نہیں ہو پا۔ اخلاق اور معیشت کا یہ گہرا تعلق پیش نظر ہو تو" کاد الفقر ان یکون کفرا" کی حدیث کی روشنی میں بقول اقبال اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

"غریبی قوائے انسانی پر بہت برا اثر ڈالتی ہے اور انسانی روح کے مجلّہ آئینہ کو اسقدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی اور تمدنی اعتبار سے اس کا وجود و عدم برابر ہو جاتا ہے"۔

اس طرح کثرتِ نعمت بھی انسان کے دل کا گداز چھین کر اسے نیاز کے بجائے ناز کا خوگر بنا دیتی ہے

اے بسا مرد حق اندیش و بصیر | مے شود از کثرتِ نعمت ضریر

کثرتِ نعمت گداز از دل برد | ناز می آرد نیاز از دل برد

حکومتِ وقت کا فرض ہے کہ وہ تنظیم دولت کے لئے آئینی، قانونی اور تنظیمی طریقے اختیار کرے تاکہ معاشرے کے اندر تقلیل و کثرت دولت کے اخلاقی مفاسد جنم نہ لینے پائیں۔ اس لئے جہاں اسلام کے عادلانہ اور متوازن نظام معیشت کے قیام میں ملکیت کا مسئلہ رکاوٹ پیدا کر رہا ہو وہاں زرعی املاک کی از سرِ نو تنظیم ضروری ہو جاتی ہے۔

زرعی لگان اور اقبال کا نقطۂ نظر

مسئلہ ملکیت زمین سے علامہ اقبال کو ہمیشہ دلچسپی رہی۔ ان کی سب سے پہلی کتاب "علم الاقتصاد" میں بھی جو ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی اس مسئلہ پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس میں وہ زرعی لگان کے باب میں بعض فلسفیوں کے حوالے سے اس خیال کو پیش کرتے ہیں کہ زمین چونکہ کسی خاص فرد یا قوم کی محنت کا نتیجہ نہیں بلکہ قدرت کا مشترکہ عطیہ ہے اس لئے اس پر قوم کے ہر فرد کو مساوی حق ملکیت حاصل ہے۔ جاگیرداری کے خلاف انہوں نے اس کتاب میں ایک اور دلیل بھی دی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں:۔

"جوں جوں آبادی بڑھتی ہے ضرورت ان زمینوں کو کاشت میں لانے پر مجبور کرتی ہے جو اس سے پہلے غیر مزروعہ پڑی تھیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو زمینیں افزائش آبادی سے پیشتر کاشت کی جاتی تھیں ان کا لگان بڑھ جاتا ہے۔ زمیندار روز بروز دولت مند ہوتے جاتے ہیں، حالانکہ یہ مزید دولت جو انہیں ملتی ہے نہ ان کی ذاتی کوشش کا نتیجہ ہوتی ہے اور نہ ہی زمینوں کے محاصل کی مقدار بڑھنے بلکہ صرف آبادی کی زیادتی سے پیدا ہوتی ہے۔ ان کی ذاتی کوششوں اور ان کی زمینوں کے محاصل کی مقدار میں کوئی فرق نہیں آتا۔ پھر انہیں کوئی حق نہیں کہ وہ دولت مند ہوتے ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ آبادی کی زیادتی سے قوم کے خاص افراد کو فائدہ پہنچے اور باقی قوم اس سے محروم رہے۔ اگر یہ فائدہ ان کی ذاتی کوششوں یا ان کی زمینوں کے محاصل بڑھ جانے کا نتیجہ ہوتا تو کوئی بات تھی لیکن جب ان کی دولت مندی کے یہ

اسباب نہیں ہیں تو صاف ظاہر ہے ان کی یہ امیری صریحاً اصولِ انصاف کے خلاف ہے"۔

حقِ انتفاع بقدرِ محنت

ان کے پورے کلام میں جگہ جگہ اس قسم کے واضح اشارات ملتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ اقبال زمین کو "ملکیت" کے بجائے "متاع" قرار دیتے ہیں جس سے صرف ایک مختصر مدت کے لئے انسان کو حقِ انتفاع بقدرِ محنت دیا گیا ہے ـــــ قرآنی آیت "الارض للہ" کے معانی میں وہ بڑی وسعت پاتے ہیں۔ ان کے نزدیک چونکہ زمین اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام نوعِ انسانی کے لئے آب و نان مہیا کرنے کا وسیلہ ہے۔ اس لئے وہ اس کی "امانت" کی حیثیت پر زور دیتے ہوئے کسی فرد (خواہ وہ مزارع ہو یا مالک) کسی بادشاہ یا کسی حکومت کا زمین پر ایسا حق تسلیم کرنے کے روادار نہیں جو انصاف اور مفادِ عامہ کے خلاف ہو جیسا کہ مندرجہ ذیل اشعار سے واضح ہوتا ہے۔

تکرار تھی مزارع و مالک میں ایک روز ۔۔۔ دونوں یہ کہہ رہے تھے میرا مال ہے زمیں
کہتا تھا وہ کرے جو زراعت اسی کا کھیت ۔۔۔ کہتا تھا یہ کہ عقل ٹھکانے تیری نہیں
پوچھا زمیں سے میں نے کہ ہے کس کا مال تُو ۔۔۔ بولی مجھے تو ہے فقط اس بات کا یقیں
مالک ہے یا مزارعِ شوریدہ حال ہے ۔۔۔ جو زیرِ آسماں ہے وہ دھرتی کا مال ہے

دا خدایا یہ زمین تیری نہیں میری نہیں ۔۔۔ تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں میری نہیں

حق زمیں را جز متاعِ ما نگفت ۔۔۔ ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت
دہ خدایا نکتۂ از من پذیر ۔۔۔ رزق و گور از وے بگیر او را مگیر
رزقِ خود را از زمیں بردن رواست ۔۔۔ ایں متاعِ بندہ و ملکِ خداست
بندۂ مومن امیں، حق مالک است ۔۔۔ غیرِ حق ہر شے کہ بینی ہالک است
آب و نانِ ماست از یک مائدہ ۔۔۔ دودۂ آدم کنفسٍ واحدہ

اے کہ می گوئی متاع ما زماست　　مرد ناداں این ہمہ ملکِ خدا ست
ارض حق را ارض خود دانی بگو　　چیست شرحِ آیۂ لاتفسدو
ابنِ آدم دل بابلیس نہاد　　من ز ابلیس ندیدم جز فساد
کس امانت را بکار خود نبرد
اے خوش آن کو ملکِ حق با حق سپرد

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب　پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمین
اقبال کے ان اشعار سے بعض لوگوں نے یہ غلط نتیجہ اخذ کیا کہ وہ زمین کو قومیانے کے حق میں تھے جیسا کہ ہم اوپر اسمبلی کی تقریر کے حوالے سے یہ بیان کر چکے ہیں، انہوں نے زمین کے لگان پر بحث کرتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ زمین حکومت کی ملکیت نہیں۔ پھر جب وہ فرماتے ہیں کہ "پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمین" تو اس میں پادشاہوں" کے لفظ کا موجودہ دور کی حکومتوں" پر بھی اطلاق ہوتا ہے اور اس لفظ کے معنی کو صرف" جاگیردار" تک محدود کر دینا مناسب نہیں ؟ چنانچہ جب وہ زمین کی زبان سے یہ کہلواتے ہیں۔

مالک ہے یا مزارع شوریدہ حال ہے
جو زیر آسماں ہے وہ دھرتی کا مال ہے

تو اس میں زمینی ملکیت کے بارے میں مالک اور مزارع دونوں کے دعویٰ ملکیت کی نفی کر رہے ہیں یا پھر جب وہ جاگیردار سے مخاطب ہوتے ہوئے فرماتے ہیں :

دہ خدایا نکتۂ از من پذیر
رزق و گور از وے بگیر او را مگیر

تو اس میں بھی مقصود درحقیقت اخلاقی تزکیہ ہے نہ کہ زمینی ملکیت کے مسئلے کا قانونی محاکمہ اور فیصلہ کیونکہ اس شعر سے متصل یہ اشعار بھی آتے ہیں ۔

صحبتش تا کے تو بود و او نہ بود　　تو وجود و او نمود بے وجود
تو عقابی طائف افلاک شو　　بال و پر بکشا و پاک از خاک شو

باطن "الارض للہ" ظاہر است — ہر کہ این ظاہر نبیند کافر است
کس نگویم درگزر از کاخ و کوئے — دولت تست این جہاں رنگ و بوئے
دانہ دانہ گوہر از خاکش بگیر — صید چون شاہین زافلاکش بگیر

اور اس سلسلے میں آگے چل کر یہ فرماتے ہیں ۔

دل برنگ و بوئے و کاخ و کو مدہ
دل حریم اوست جز با او مدہ

تصور زمین پیوندی کا تدارک

ظاہر ہے اگر اس پورے سیاق و سباق کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ جاننے میں ہرگز کوئی دشواری پیش نہیں آتی کہ بات "ملکیت زمین" کے قانونی پہلوؤں پر نہیں ہو رہی بلکہ زمین کے ساتھ ان غلط ذہنی اور جذباتی رشتوں کی اصلاح مقصود ہے جن کی وجہ سے "ملکیت" کا تصور زمین پیوندی (EARTH ROOTEDNESS) کی صورت میں "حریم دل" کے اندر جگہ پالیتا ہے اور انسان یہ بھول جاتا ہے کہ "متاع الی حین" کے مصداق زمین سے اس کا تعلق بالکل عارضی اور ناپائیدار ہے اور جس زمین کو وہ آج اپنا مال سمجھ رہا ہے کل کو خاک میں مل کر خاک ہو جانے پر وہ اس کا مال بن جانیوالا ہے۔ بغرض مسئلہ زمین کے بارے میں قرآن کا آفاقی نقطۂ نظر پیش کرنا ہے تاکہ وہ اپنی خودی کی نشوونما سے غافل نہ ہو۔ قرآن حکیم زمین کو "متاع" قرار دیتا ہے جس کی رو سے انسان کو اس پر معاشی تصرف کا حق دیا گیا ہے جو تصور ملکیت کی بنیاد ہے اور بقول ڈاکٹر برہان احمد فاروقی ملکیت کا قرآنی مفہوم یہ ہے کہ تمتع کیا جائے اور تمتع کرنے دیا جائے۔ کیونکہ قرآن حکیم "یمنعون الماعون" کے مصداق اپنی انتہائی نجی ملکیت یعنی گھریلو استعمال کی چیزوں تک سے بھی دوسروں کو تمتع کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ لیکن ہمارے معاشرے میں جاگیردارانہ مفاد پرستی نے زمین کے بارے میں جو ذہنیت پیدا کی ہے اس کی رو سے ملکیت کا مفہوم جاگیردار کو یہ حق دیتا ہے کہ نہ تمتع کرو اور نہ تمتع کرنے دو جو کہ سراسر اسلام کے خلاف ہے۔ حضرت عمرؓ نے بلالؓ بن حارث المذنی سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بخشی ہوئی جاگیر بھی جسے وہ کاشت نہیں کرتے تھے ملی مفاد کی خاطر چھین لی تھی اور ان کے پاس صرف اتنا حصہ رہنے دیا جسے وہ خود کاشت کی قدرت رکھتے تھے۔

نجات اللہ صدیقی "اسلام کا نظریہ ملکیت" میں رقمطراز ہیں :

"حقوق فرائض کی خاطر دیئے گئے ہیں اور انہی پر مبنی ہیں۔ حقوق کی نوعیت اور ان کے حدود متعلقہ فرائض کی نوعیت اور ان کے حدود سے متعین ہوتے ہیں۔ اصل زور فرض پر دیا گیا ہے۔ حق کی اہمیت اس کے تحت آتی ہے۔ دُنیا میں انسان کی اصل حیثیت ایک "مکلّف" یا ذمہ دار ہستی کی ہے نہ کہ "مقدار" کی۔ معاصر مغربی تہذیب نے حقوق و فرائض کی یہ فطری ترتیب بالکل الٹ دی ہے اور ایک ایسا مزاج بنا دیا ہے جو سماجی فکر کا آغاز فرد کے حقوق سے کرتا ہے نہ کہ اس کی ذمہ داریوں سے"۔

آگے چل کر صدیقی صاحب فرائض اور حقوق کو ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم قرار دیتے ہوئے یوں کہتے ہیں :

"اسلام انفرادی حقوق کی کسی مطلق اور مقدس فہرست کا قائل نہیں۔ حقوق کسی کے بھی ہوں، فرد کے یا ریاست کے غیر مشروط مطلق اور مقدس نہیں ہوتے۔ ان کی نوعیت اور وسعت کا انحصار تمام تر ان ذمہ داریوں پر ہوتا ہے جن کی انجام دہی کے لئے وہ دیئے گئے ہوں"۔

حق ملکیت کے بارے میں صدیقی صاحب کا نقطۂ نظر یہ ہے :

"پہلی بات یہ ہے کہ فرد، ریاست اور اجتماع تینوں کے اعمال و وظائف اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ انہیں مالکانہ حقوق حاصل ہوں۔ اگر ان میں سے کسی ایک کو بھی حقوق ملکیت سے یکسر محروم کر دیا گیا تو وہ ان ذرائع اور وسائل سے محروم رہ جائے گا جو اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اسے درکار ہیں۔ لہٰذا خود ریاست اور اجتماع دونوں مال و املاک رکھنے اور مالکانہ تصرف کرنے کے مجاز ہیں"۔

سید نذیر نیازی صاحب نے اپنی کتاب "اقبال کے حضور میں" میں ۴ جنوری ۱۹۳۸ء کو مسئلہ ملکیت زمین پر ایک گفتگو کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ قدرے سکوت کے بعد کہنے لگے۔ "اب حالات بدل گئے ہیں پُرانے خیالات کی جگہ نئے خیالات نے لے لی ہے اور دُنیا میں ایک ایسا نظام بھی قائم ہے جو زمین پر افراد کا حق ملکیت تسلیم نہیں کرتا۔ لوگوں نے کہنا شروع کر دیا ہے کہ اسلام کا قانون وراثت بڑا خوب ہے۔ اس کی

غایت ہے دولت کی تقسیم در تقسیم تاکہ زراندوزی کی نوبت نہ آئے، نہ اجارہ داری کی، نہ جاگیریں ہوں، نہ زمیندار اور کاشتکار کا باہمی نزاع۔ یوں نظام سرمایہ داری پر بھی کڑی ضرب لگتی ہے۔ رہی زمین سو اللہ کا مال ہے اس پر کسی کو حق ملکیت نہیں"۔

اس اقتباس سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ علامہ اقبال زمین کو روسی اشتراکیت کی طرز پر قومیانے کے حق میں تھے۔ لیکن اس سے ذرا پہلے کی گفتگو کا یہ حصہ خاص طور پر قابلِ غور ہے۔ ارشاد ہوا: "دراصل ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے فقہا نے زمین کے مسئلے پر جو کچھ لکھا ہے اس کا بہ تحقیق مطالعہ کیا جائے۔ پھر ماہرین فن موجودہ حالات کی رعایت سے اس مسئلے پر غور کریں۔ زمین کی حیثیت بہر حال یہ نہیں کہ ہم اس پر عام اشیائے استعمال کی طرح حق ملکیت تسلیم کریں"۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کے نزدیک اسلامی حکومت وقت کے تقاضوں کے مطابق زرعی نظام میں ضروری تغیرات اور اصلاحات کی مجاز ہے جس کے لئے وہ زمین کے مسئلے پر فقہی لٹریچر اور جدید ماہرین فن کی آراء کی روشنی میں اجتہاد ضروری خیال کرتے تھے۔

"انوار اقبال" میں علامہ اقبال کا خواجہ عبدالرحیم کے نام ایک خط موجود ہے۔ اس خط میں علامہ صاحب فرماتے ہیں:-

"اسلام کے نزدیک زمین وغیرہ امانت ہے۔ ملکیت مطلقہ جس کو قدیم و جدید قانون تسلیم کرتے ہیں میری ناقص رائے میں اسلام نہیں۔

فقہا میں بہت سا اختلاف ہے...... زمین کے متعلق تھوڑی سی بحث اشارۃً جاوید نامہ میں بھی ہے جو زیر طبع ہے"۔

روس کی اشتراکیت حکومت کی تقلید میں اور اشتراکی معنوں میں زمین کا قومیانہ ان کے پیش نظر ہرگز نہیں تھا بلکہ ان کا خیال تو یہ تھا کہ جب اسلام کو ایک عوامی تحریک کی حیثیت حاصل ہو جائے گی اور اس کے نتیجے میں اسلام ایک سیاسی اجتماعی نظام مدنیت کی صورت میں معرض وجود میں آ جائے گا تو ان مسائل کے حل کی صورتیں خود بخود نکل آئیں گی۔

سید نذیر نیازی نے سیالکوٹ میں یوم اقبال کے سلسلے میں اسلام کے معاشی نظام پر علامہ اقبال کے خیالات پر مشتمل ایک مقالہ لکھنا چاہا اور اس ضمن میں حضرت علامہ سے تصریحات چاہیں۔ آپ نے اس

گفتگو میں جو ارشادات فرمائے وہ قابلِ غور ہیں۔ ۱۴ جنوری ۱۹۳۸ء کے ملفوظات میں سید نذیر نیازی لکھتے ہیں: "میں نے کہا ایک مسئلہ ہے ارشاد ہو تو عرض کروں ۔۔ فرمایا " کیا ؟" ۔۔ میں نے عرض کیا یہ زمانہ سرمائے اور محنت کی کش مکش کا ہے۔ ایک طرف اشتراکیت ہے دوسری جانب سرمایہ داری۔ ارشاد ہوا "ٹھیک ہے لیکن تمہارا سوال کیا ہے ؟" عرض کیا سوال یہ ہے کہ مسائل دولت پر گفتگو کیجئے یا فلاح عامہ کا ذکر چھیڑیے یا کوئی ایسی بات کیجئے جس سے سیاسی اور معاشی انصاف کا پہلو نکلے تو لوگ بدظن ہو جاتے ہیں۔ مزدور کا حق زبان پر لایئے تو اعتراض ہوتا ہے۔ یہ اشتراکیت کی منطق ہے۔ اس سے مادیت اور لادینی کی بو آتی ہے۔ فرد کی صلاحیتوں حریت اور آزادی پر زور دیجئے تو معترض سمجھتا ہے سرمایہ داری کی حمایت کی جا رہی ہے۔ حضرت علامہ بتوجہ میری معروضات سن رہے تھے فرمایا: "جو کچھ تم کہہ رہے ہو تمہارے سوال کی تمہید ہے سوال کیا ہے ؟"

میں نے طوالت کلام پر معذرت کرتے ہوئے عرض کیا سوال یہ ہے کہ بحالت موجودہ ہمارے سامنے دو ہی نظام ہیں اشتراکیت اور سرمایہ داری۔ دونوں ایک دوسرے سے متصادم ایک دوسرے کی ضد۔ مگر دونوں اس امر کے دعویدار کہ انسان کی بھلائی انہیں میں ہے۔ اسلام بظاہر دونوں کے خلاف ہے گویا یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ اس میں دونوں کی گنجائش ہے۔ حالانکہ یہ دونوں نظام باہم جمع نہیں ہو سکتے۔ اندریں صورت ہم کیا کہیں کہ اسلام کی روش سرمایہ اور محنت کے بارے میں کیا ہے ؟ یعنی اس کے نظام اجتماع و عمران میں سیاست اور معاش کو باہم تعلق کیا ہے ؟ بالفاظ دیگر وہ کیا نظام معیشت ہے جو از روئے شریعت وجود میں آئے گا ؟

ارشاد ہوا: "تم ابھی تک اپنا سوال متعین نہیں کر سکے۔ تم نے جو بات کہی وہ ایک طویل اصولی بحث ہے۔ تمہارا ذہن اس بحث کی طرف منتقل ہوا تو کیونکر ؟ تمہاری مشکل کیا ہے ؟" میں نے عرض کیا زمین کی ملکیت اور عدم ملکیت کے مسئلے سے۔ اس لیے کہ اشتراکیت اور سرمایہ داری کی بحث میں سر دست یہی مسئلہ ہمارے سامنے ہے۔ کارخانہ داری کی تو ابھی ابتدا ہے۔ یہ مسئلہ طے ہو جائے تو بحیثیت ایک قوم ہم اپنا موقف بھی متعین کر سکیں۔ نہ یہ کہا جائے کہ دین سے انحراف ہو رہا ہے، نہ یہ کہ دین کیا ہے ؟ محض سرمایہ داری کا پردہ !

ارشاد ہوا: "زمین کے بارے میں شریعت کے احکام واضح ہیں۔ قرآنِ پاک نے صاف اور

صریح الفاظ میں کہہ دیا ہے (الارض للہ (جیسے الملک للہ، الحکم للہ) البتہ اس سلسلے میں جو مشکل ہے وہ یہ کہ اسلام جیسا کہ بارہا کہہ چکا ہوں دین ہے مذہب نہیں۔ لہٰذا جہاں تک سیاسی اور معاشی مسائل کا تعلق ہے ہم کہہ سکتے ہیں اسلام ایک عمرانی تحریک بھی ہے لیکن یہی نکتہ ہے جو لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا لہٰذا اس سلسلے میں جو بے سر و پا سوالات اٹھائے جاتے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ بحیثیت ایک نظامِ مدنیت اسلام ہمارے سامنے نہیں آیا۔ یہ نظامِ مدنیت ایک نہ ایک دن سامنے آئے گا لیکن اس وقت جب مسلمانوں کا شعورِ ملی بیدار ہوگا اور وہ سمجھیں گے کہ حیاتِ ملی عبارت ہے ایک سیاسی اجتماعی ہیئت سے نہ کہ ایک اخلاقی اور مذہبی نظام سے۔ ذرا اس شعور کو بیدار ہو لینے دو زمانہ خود ہی سمجھا دے گا کہ مسائل کیا ہوتے ہیں اور ان کا ہر پہلو واضح طور پر سامنے رکھو۔ مدار بحث بھی سر تا سر اسلام ہی کو ہونا چاہیئے۔ جو کچھ لکھو اصولاً اور با احتیاط۔

اسلام اور مسئلہ حقوق و فرائض

اسلام کا نظامِ معیشت اشتراکیت اور سرمایہ داری دونوں سے قطعی طور پر مختلف ہے کیونکہ یہ نظامِ معیشت ایک ایسی عمرانی تحریک سے معرضِ وجود میں آتا ہے جو بنی نوع انسان کی وحدت کی بنا پر اخلاقی جدوجہد کرنے والے روحانی الذہن افراد سے تشکیل پاتی ہے جس میں معیشت اور نیکی ایک دوسرے کو پروان چڑھاتے ہیں۔ ہر زمانے میں طریقِ پیداوار کے بدل جانے سے چونکہ نظامِ معیشت کا ڈھانچہ بھی تبدیل ہو جاتا ہے اس لئے اس میں انفرادی اور اجتماعی حقوق میں تصادم ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اسلام اس تصادم کو روکنے کی جو تدبیر کرتا ہے وہ نفسیات انسانی میں ایک حد درجہ اہم تبدیلی ہے جس کی رو سے معاشرہ میں طلبِ حقوق پر زور دیا جاتا ہے۔ اس نکتے کو ڈاکٹر برہان احمد فاروقی صاحب نے بڑی خوبصورتی سے واضح کیا ہے، وہ فرماتے ہیں :۔

"جاہلی اور کافرانہ معاشرہ مطالبہ حقوق کے اصرار پر قائم ہوتا ہے، چاہے وہ اصرار جمہوری اور سرمایہ داری نظام میں انفرادی حقوق اور انفرادی آزادی کے لئے ہو یا اشتراکی نظام میں اجتماعی حقوق کے لئے۔ اس لئے دونوں نظاموں میں انفرادی اور اجتماعی حقوق کا تصادم ہمیشہ برقرار رہا ہے جب تک حقوق کا یہ تصادم رفع نہ ہو معاشرہ اسلامی نہیں بن سکتا۔ اسلام کی برتری اس وقت واضح ہوگی جب انفرادی اور اجتماعی حقوق کا تصادم ایک واقعہ ہو اور سوال یہ پیدا ہو کہ اسلام اس تصادم

کی پیش بینی کر کے اسے کسی حتمی قطعی اور یقینی تدبیر سے دُور کرتا ہے۔ جس کا جواب یہ ہے کہ اسلام جس قسم کا معاشرہ پیدا کرنا چاہتا ہے اس میں اخلاقی جدوجہد کرنے والے افراد کی سیرت کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ محرک اعمال فرض کی بجاآوری کی نیت ہو اور اگر اصرار فرائض کی بجاآوری پر ہو تو حقوق خواہ وہ افراد کے ہوں یا اجتماع کے، حاکم کے ہوں یا محکوم کے خود بخود ادا ہو جائیں گے اور انفرادی اور اجتماعی حقوق کا تصادم دور ہو جائے گا۔ اس کے برعکس جاہلی اور کافرانہ معاشروں میں مطالبہ حقوق پر اصرار دشمنی کی فضا پیدا کرتا ہے جو حقوق طلب کرتا ہے اس کا ذہن بھی معاندانہ ہوتا ہے اور جس سے حقوق طلب کئے جاتے ہیں اس کی نفسیات میں جواباً عناد کی نفسیات بن جاتی ہے جس کی وجہ سے معاشرہ کے اندر حقوق کے تصادم کا رفع ہونا ناممکن ہو جاتا ہے۔

ملکیتِ زمین کے تین اصول

خلاصۂ کلام یہ کہ مسئلہ ملکیت کے بارے میں علامہ اقبال نے جو کچھ کہا ہے اس کا منتہا اور مقصود درحقیقت زمین کے بارے میں قرآن کا آفاقی نقطۂ نظر پیش کرنا ہے۔ ملکیتِ زمین کے بارے میں کسی قسم کا حتمی، آئینی یا قانونی فیصلہ دینا نہیں البتہ ملکیت زمین کے ضمن میں جو تین اصول آپ کی مختلف تحریروں سے مترشح ہوتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ اسلام میں زمین پر انسان کی ملکیت مطلقہ کا کوئی تصور نہیں بلکہ کفالتِ عامہ کے نقطۂ نظر سے استفادۂ زمین ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل ہو۔

۲۔ زمین پر محنت اور کاشت کرنے کے حقوق کا تحفظ جس سے معاشرے میں عدل وانصاف کا دور دورہ ہو۔

۳۔ ایسے معاشی نظام کی تشکیل جس میں خودی کی نشوونما کی پوری ضمانت ہو۔

زمین بطور متاع اور امانت

زمین کے متاع ہونے کا قرآنی تصوّر جس پر علامہ اقبال نے اس قدر زور دیا ہے نہ صرف اپنے اخلاقی اور روحانی مضمرات کی بناء پر اہمیت رکھتا ہے بلکہ زرعی منصوبہ بندی میں اس کے عملی اور اطلاقی

امکانات بھی کچھ کم اہم نہیں ہیں۔ "ملکیت" کے معنی کسی چیز کو اپنے قبضہ یا اختیار میں لینے اور "متاع" کے معنی سامان اور پونجی کے ہیں۔ چنانچہ لغت کے اعتبار سے بھی اگرچہ دونوں کے مفہوم میں فرق ہے لیکن قرآنِ حکیم اپنے الفاظ کو بالعموم خود اپنی طرف سے بھی مخصوص معنی عطا کرتا ہے اور ہمارے لئے یہی معنی زیادہ اہمیت رکھتے ہیں، کیونکہ قرآن کی حیثیت ایک ادب کی کتاب نہیں بلکہ کتاب الہدیٰ کی ہے۔ ذرا غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ قرآن حکیم جب "متاع" کے لفظ کو حیاتِ دنیا کے ساتھ استعمال کرتا ہے تو حیاتِ دُنیا کی بے ثباتی کے حوالے سے اس لفظ میں "عارضی" اور "ناپائیدار" کا مفہوم داخل کر دیتا ہے۔ علامہ اقبال جب بھی زمین کے بارے میں متاع کا لفظ استعمال کرتے ہیں، انہی معنوں میں کرتے ہیں۔

کسی شے کی ملکیت کا تصور جب انسانی ذہن میں راسخ ہو جائے اور رغبتِ نفس اور محبت کی صورت اختیار کر کے اسے زندگی کی اعلیٰ اقدار سے غافل کر دے تو قرآن حکیم انسانی فکر کی اس کجروی کی اصلاح کے لئے "متاع" کا تصور دیتا ہے، جیسا کہ درج ذیل آیت سے ظاہر ہے:

"لوگوں کے لئے مرغوبات نفس عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، چیدہ گھوڑے، مویشی اور زرعی زمینیں بڑی خوش آیند بنا دی گئی ہیں۔ مگر یہ سب چند روزہ زندگی کی "متاع" ہیں حقیقت میں جو بہترین ٹھکانہ ہے وہ تو اللہ کے پاس ہے"۔ (آل عمران)

ملکیت اور متاع کا بنیادی فرق

یہ آیت "ملکیت" اور "متاع" کے بنیادی فرق کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے۔ ملکیت کے تصور میں پائیداری اور مستقل ہونے کا مفہوم ملتا ہے۔ جب کہ متاع کے تصور میں ناپائیداری اور عارضی استفادہ کے معنی پائے جاتے ہیں۔ (ایک دوسری جگہ قرآن میں ملکیت کے تصور پر کاری ضرب لگانے کے لئے "غرور" یعنی دھوکا کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ درآنحالیکہ وہ اس دُنیا کو بھی ایک حقیقت تسلیم کرتا ہے۔ درحقیقت اس دُنیا کی تمام چیزوں کے بارے میں مومن "متاع" کا تصور ہی رکھتا ہے اور یہی مومن کی نفسیات اور پاکیزگیٔ اخلاق ہے لیکن تعجب اس بات پر ہے کہ جہاں ہم انصارِ مدینہ کی اس نفسیات کو اخلاقی فضیلت کا کمال مانتے ہیں کہ انہوں نے ایک موقع پر اپنی ایک سے زائد بیویوں کو طلاق دیکر ان کے نکاح مہاجرینِ مکہ سے کر دینے میں بھی کوئی گرانی محسوس نہیں کی (کیا یہ محض افسانوی قصے

ہی ہیں یا ان میں ہمارے لئے کوئی اخلاقی سبق بھی ہے ؟) وہاں ہم ملکیت زمین کے سوال پر اپنے اندر کوئی معمولی سے معمولی تبدیلی پیدا کرنے کو بھی تیار نہیں ہیں۔ حالانکہ پیداواری طریقوں میں انقلابی تبدیلیوں کی وجہ سے قطعات اراضی کی حد بندیوں سے قائم ہونے والا انتہائی فرسودہ ملکیتی تصور معاشی ترقی اور معاشی انصاف دونوں کی راہ میں سنگِ گراں بن کر حائل ہے۔

این ایف پیٹرسن زراعت کو ایک معاشرتی عمل قرار دیتے ہوئے لکھتا ہے :-

"زراعت کا کام بہت بڑی حد تک ایک معاشرتی عمل ہے۔ جوں جوں زراعت زیادہ منظم ہوتی جاتی ہے توں توں یہ معاشرتی تنظیم کے لئے زیادہ حساس ہوتی جاتی ہے۔ شمالی امریکہ، بہت سے یورپی ممالک اور جاپان میں زراعت اور معاشرتی تنظیم کے مابین ضروری معاشرتی توافق پیدا کر لیا گیا ہے"۔

زراعت میں ایک بڑا معاشرتی اختراع زمین کی نجی ملکیت کا تصور تھا جس نے زمین کو عام دخل اندازی سے محفوظ رکھا اور اس طرح حالات پر قابو پا کر اس میں فصل کاشت کرنے کے مقاصد کو ممکن بنایا۔ پھر اس طرح صنعتی انقلاب بھی ایک عظیم معاشرتی اختراع تھا جس نے گوناگوں طریقوں سے زراعت کو مثبت طور پر متاثر کیا جن میں ایک طریقہ فاضل غذائی اجناس کے لئے بڑی بڑی منڈیاں فراہم کرنا تھا۔

اسلامی فقہ اور زمینی حد بندی

ہماری فقہ نے جس زمانے میں حد بندی کی بناء پر قائم ہونے والے تصور کو قانونی تحفظ دیا اس زمانے کے زرعی مسائل اور پیداواری طریقے بالکل مختلف نوعیت کے تھے۔ اس لئے اس قسم کی زمینی ملکیت کو تسلیم کرنا اور برقرار رکھنا بالکل بجا اور روا تھا۔ اس دَور کے پیداواری طریقوں کے مطابق زراعت میں پیمائش رقبہ ہی پیمائش معاش کا واحد پیمانہ تھا۔ اس لئے قطعات زمین کی حد بندی کو قانونی تحفظ دینا ناگزیر تھا اور یہ صورت چونکہ صدیوں تک قائم رہی، اس لئے زمین کے سلسلے میں حد بندی ہی ملکیت کی واقعاتی اور قانونی علامت قرار پائی۔ لیکن اس سے زمینی محبت اور زمین پیوندی کے جو جذبات ہمارے کاشت کاروں کے دلوں میں گھر کر گئے ہیں وہ مطعون ہونے کے بجائے ہمارے نزدیک

"انسان کی فطرت" "انسان کا شرف" اور "بنیادی انسانی حقوق" کے ناموں سے "تقدس" کا درجہ پا گئے ہیں۔ حد بندی کی وٹوں کو قائم رکھنے یا مٹانے پر کسان اپنی جان تک کی بازی لگا دیتا ہے اور تصور ملکیت کو کسی صورت چھوڑنے پر تیار نہیں۔ خواہ یہ مفاد عامہ کے لئے کتنا ہی ضروری کیوں نہ ہو اور خواہ اس میں اس کا اپنا ذاتی اقتصادی مفاد ہی کیوں نہ ہو اس قسم کی حد بندی پر مبنی تصور ملکیت پر اصرار کی مہمل ترین مثال کومیلا (مسلم بنگال) میں کوآپریٹو فارمنگ کے تجربے کے ضمن میں ملتی ہے۔

تصورِ متاع کا شجرِ طیبہ

یہی نہیں بلکہ زمین کے بارے میں تصور ملکیت اور تصور متاع سے دو مختلف نظریہ ہائے حیات کے شجر پھوٹتے ہیں۔ تصور ملکیت کے بیج سے وہ شجر خبیثہ پھوٹتا ہے جو سراسر دنیوی طرز فکر کے برگ و بار پیدا کرتا ہے۔ امریکی صدر جیفرسن نے اپنی تمام تحریروں میں کسان کی زمینی ملکیت پر زور دیا کیوں کہ اس کے نزدیک اس سے نظریۂ وطنیت اور جمہوریت کو فروغ ملتا ہے۔ اس کی تشریح وہ یوں کرتا ہے کہ زمین کا مالک کاشت کار اپنی زمین پیوندی کی وجہ سے ہمیشہ محب وطن ہوتا ہے بلکہ وہی نظریۂ وطنیت کا بنیادی پتھر ہے اور چونکہ وہ اپنے کھیت میں آزادانہ فیصلے کرتا ہے اس لئے جمہوریت نوازی (یعنی ایسی آزادی جو اس کے ذاتی مفادات کی حفاظت کر سکے) اس کی فطرت ثانیہ بن جاتی ہے۔ لیکن اسلام انسان کو زمینی رشتے کے بارے میں متاع کا تصور دے کر اسے تصورِ آخرت سے مربوط کرتا ہے۔ اس لئے اس سے جو شجرِ طیبہ پھوٹتا ہے اس کی جڑیں سیاسیات (یعنی خلافت) میں نہایت مضبوطی سے پیوست، شاخیں اخلاقیات میں آسمانوں کی پہنائیوں تک پھیلتی ہوئی اور معاشیات (رزق) میں ہر آن بار آوری کے نتائج پیدا کرتی رہتی ہیں۔ بقول اقبال:

کھینچیں نہ اگر تجھ کو چمن کے خس و خاشاک
گلشن بھی ہے اک سر سرا پردہ افلاک

وطنیت کی اساس

بار برا وارڈ (BARBRA WARD) اس خیال کی مؤید ہیں کہ زمینی ملکیت کا تصور ہی پرانے

زمانوں میں سلطنتوں کے قیام و انصرام کا باعث اور دورِ حاضر میں وطنیت کی اساس بنتا تھا۔ چنانچہ وہ لکھتی ہیں کہ زمینیں جب سردار قبیلہ کی ملکیت بن جاتی تھیں تو سردار قبیلہ کو حکمرانی کا منصب خود بخود مل جاتا تھا اور قبائل کے زیادہ سے زیادہ سردار اور جاگیردار جب کسی ایک بڑے سردار کی وفاداری کا دم بھرنے لگتے تھے تو سلطنت قائم ہو جاتی تھی۔ تمام بڑی بڑی سلطنتیں اس بنیاد پر معرض وجود میں آئیں۔ برصغیر ہند و پاک میں انگریز نے بھی اسی مقصد کے پیش نظر جاگیرداری کو فروغ دے کر اپنے وفادار پیدا کئے۔ اس نظام جاگیرداری کے تحت ملت اسلامیہ کا سواد اعظم تو معاشی بدحالی میں مبتلا ہو گیا اور ایک مختصر اقلیت عیش کوشی میں مگن انگریز کی وفاداری کا دم بھرتی رہی اور اعلیٰ ملی مقاصد کی ان کے دل میں کوئی اہمیت نہ رہی۔ پنجاب میں اس کی بدترین مثال یونینیسٹ پارٹی کی سیاست تھی جس سے علامہ اقبال اپنے آخری ایام میں بھی دل گرفتہ رہے۔ سید نذیر نیازی ۲۶ فروری ۱۹۳۸ء کے ملفوظات میں رقم طراز ہیں :-

"پنجاب کا ذکر آ گیا فرمایا : سارا معاملہ پنجاب کے زمینداروں کا ہے۔ پنجاب کے زمیندار کب سمجھیں گے؟ انہیں کب احساس ہو گا؟ یونینسٹ پارٹی کی سیاست بڑی ناقص ہے"۔

ہم نے بات کو طول نہیں دیا۔ حضرت علامہ کا اشارہ شاید اس امر کی طرف تھا کہ سیاسی اعتبار سے جب یہ طے ہے کہ زمینداروں کا یہ ٹولہ جسے یونینسٹ پارٹی کہا جاتا ہے ہمیشہ ہندوؤں اور سکھوں کے امداد و تعاون کا محتاج رہے گا تو یہ بھی ممکن ہے کہ آگے چل کر یہی محتاجی ان کے انفرادی مفاد کو بھی محفوظ نہ رکھ سکے۔ اسے اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے یا محض معاشی فلاح و بہبود کے خیال سے ان کی رجعت پسندی میں کوئی شبہ نہ تھا۔ لہذا کوئی بھی نقطۂ نظر ہو اسلامی یا محض معاشی، سوال یہ تھا کہ پنجاب کا زمیندار کب یہ سمجھے گا کہ زندگی صرف فصل کی کاشت اور غور پرداخت نہیں ہے، اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔ یہ بہر حال نہیں ہے کہ انسان کی توجہ تمام عمر زمین ہی پر مرتکز رہے۔ مذہب و سیاست کی طرح اسے علم و حکمت سے بھی کوئی دلچسپی نہ ہو جیسے بجز کاشتکاری زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں۔

زرعی نظام کی تنظیم نو

چنانچہ قیام پاکستان کے بعد ضرورت اس بات کی تھی کہ زرعی نظام کی تنظیمِ نو پر سب سے پہلے توجہ کی جاتی لیکن سیاسی اور معاشی اعتبار سے سب سے زیادہ خرابی اس شعبے میں پائی جاتی تھی۔ علامہ اقبال زندہ ہوتے تو شاید حکومت اور ملت دونوں کو اس کی اہمیت کا احساس دلاتے لیکن افسوس ایسا نہ ہوا۔ جاگیرداری جوں کی توں برقرار رہی اور ملک کی اسی (۸۰) فیصد زراعت پیشہ آبادی کی سیاسی، سماجی اور معاشی اصلاح کا کوئی پروگرام وضع نہ کیا جا سکا۔ زرعی اصلاحات (اپنی تمام تر کمیوں کے ساتھ) ۱۹۶۰ء سے پہلے نافذ نہ ہو سکیں۔ درحقیقت ۱۹۶۸ء سے پہلے سیاسی جماعتوں نے زرعی مسائل پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی بلکہ انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو اس معاملے میں زیادہ تر کریڈٹ سابق صدر ایوب کو جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی تقاریر میں بار بار دیہی اور زرعی مسائل کا ذکر کر کے انہیں قومی توجہ کا مرکز بنا دیا جس کے ردِ عمل میں مخالف سیاسی جماعتوں کو بھی اپنے منشوروں میں زرعی مسائل کو اہمیت دینی پڑی۔ (بلکہ اب تو کئی سیاسی اور نیم سیاسی تنظیمیں خالص زراعت پیشہ آبادی کی فلاح و بہبود کے لئے قائم ہو گئی ہیں۔ زراعت کی سیاسی اہمیت کے شعور کو ابھارنے میں زراعت میں نئی ٹکنالوجی کے نفوذ کی وجہ سے پیش آمدہ معاشی پیچیدگیوں کو بھی دخل ہے۔) چنانچہ تحدید ملکیت زمین کا مسئلہ بھی انہیں دنوں اٹھا اور کم و بیش تمام جماعتوں نے تحدید ملکیتِ زمین کے اصول کو اصولاً تسلیم کر لیا۔ تحدید ملکیت زمین پر اجماع امت ہونے کی وجہ سے اب کھیت کی حدبندی کا وہ "تقدس" قائم نہیں رہا جس پر مذہبی حلقوں کی طرف سے اس شدت سے اصرار کیا جاتا تھا کہ گویا یہ بھی کفر و ایمان کا مسئلہ ہے اور اب شاید تصورِ متاع کی بنیاد زراعت کی تنظیم نو بھی سنجیدگی سے غور کرنا ممکن ہو سکے۔

تنظیمِ نو کے لئے لائحہ عمل

زرعی نظام کی تشکیلِ نو میں سب سے پہلے کرنے کا کام یہ ہے کہ استحصال کی ہر صورت کو ختم کر دیا جائے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ جاگیرداری کی کسی صورت کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے۔ البتہ وہ بڑے بڑے زمیندار جو کاشت کاری کو جدید ترین طریقوں کے مطابق اپنا کر زمین سے پوری پوری پیداوار

حاصل کرنے پر قادر ہوں، ان سے تعرض نہیں کرنا چاہیئے کہ ان پر یہ پابندی بھی ضرور لگانی چاہیئے کہ وہ اپنی رہائش بھی گاؤں ہی میں رکھیں۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ چونکہ ہمارے دیہات میں ذرائع رسل و رسائل نہ ہونے کے برابر، تعلیمی، طبّی اور حفظانِ صحت کی سہولتوں کا فقدان اور تفریحی اور تہذیبی مشاغل کی کمی پائی جاتی ہے اس لیئے خوشحال متمول زمیندار وہاں رہنا پسند نہیں کرتے اور شہروں کی طرف رجوع کر رہے ہیں۔ اس طرح دیہی علاقوں کی دولت تمام تر کھنچ کر شہروں میں آجاتی ہے۔ دیہی علاقے اپنی پیدا کردہ دولت کی برکات سے محروم رہ جاتے ہیں اور دیہی زندگی کی روایتی پسماندگی اور سنگین جمود ٹوٹنے کی بھی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اس صورت حال کی بدترین مثال جنوبی امریکہ کے ایک ملک ارجنٹائن میں ملتی ہے جو رقبے میں مغربی پاکستان سے کئی گنا زیادہ ہے۔ زرعی اعتبار سے بھی یہ بہت زرخیز ہے اور مویشی پالنے میں کافی شہرت رکھتا ہے۔ ہر سال لاکھوں کروڑوں من گوشت اور اون یورپ اور دیگر ممالک کو برآمد کرتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہاں دیہی معاشرہ کی معاشی حالت ہماری دیہی آبادی سے بھی بدتر ہے جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اگرچہ وہاں بڑی بڑی زمینداریاں ہیں لیکن کسی بھی زمیندار کو اپنے دیہی علاقے میں رہنا گوارا نہیں۔ ملک بھر کے زمیندار صرف ایک شہر بیونس آئرز میں رہتے ہیں جو اس ملک کا دارالحکومت ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ملک بھر کی پیدا کردہ زرعی دولت تمام تر ایک ہی شہر میں سمٹ آئی ہے جو امرا کی عیش کوشیوں کا مرکز بن گیا ہے اور اس ملک کے دیہی علاقے اپنی پیدا کردہ دولت کی آسائشوں سے یکسر محروم ہیں۔ ایسی ہی صورت حال پر علامہ اقبال کے مندرجہ ذیل اشعار منطبق ہوتے ہیں:۔

تاج پہنایا ہے کس کی بے کلاہی نے اسے
کس کی عریانی نے بخشی ہے اسے زریں قبا
اس کے آب لالہ گوں کی خونِ دہقاں سے کشید
تیرے میرے کھیت کی مٹی ہے اس کی کیمیا
اس کے نعمت خانے کی ہر چیز ہے مانگی ہوئی
دینے والا کون ہے؟ مردِ غریب و بے نوا

علامہ اقبال بڑے بڑے شہر قائم کرنے کے اسی لئے خلاف تھے۔ چنانچہ مسولینی سے جب ان کی ملاقات ہوئی تو آپ نے اسے یہ مشورہ دیا کہ بڑے شہروں کے بجائے چھوٹے چھوٹے شہر بسائے جائیں

کیونکہ شہر کی آبادی جس قدر بڑھتی ہے اس کی تہذیبی اور اقتصادی توانائی کم ہوجاتی ہے اور ثقافتی توانائی کی جگہ محرکاتِ شر لے لیتے ہیں۔

ہیں گرچہ بلندی میں عمارات فلک بوس
ہر شہر حقیقت میں ہے ویرانہ آباد

سولینی سے گفت گو کے دوران میں آپ نے اس پر یہ بھی واضح کیا تھا کہ یہ ان کا ذاتی نظریہ نہیں بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے صدیوں پہلے یہ مصلحت آمیز ہدایت فرمائی تھی کہ جب مدینہ منورہ کی آبادی ایک حد سے تجاوز کر جائے تو مزید لوگوں کو اس پر آباد ہونے کی اجازت دینے کے بجائے دوسرا شہر آباد کیا جائے۔

اگر منصوبہ بندی میں اس ہدایت کو پیش نظر رکھا جاتا تو آج نہ صرف ہماری دیہی آبادی کی خوشحالی میں اضافہ ہوتا بلکہ ہماری اقتصادیات بھی مضبوط بنیادوں پر استوار ہوتی۔ مثال کے طور پر اگر کسی ایک صنعت مثلاً پارچہ بافی کے تمام کارخانے ایک دو بڑے شہروں میں قائم کرنے کے بجائے کپاس پیدا کرنے والے علاقے میں ریلوے لائن یا سڑک کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے شہروں میں چھوٹے چھوٹے کارخانے قائم کر دیئے جاتے تو ایسی صورت میں ملک مجموعی طور پر ترقی کرتا اور زمین پر سے غیر ضروری انسانی بوجھ دور کرنے میں بھی آسانی رہتی۔ یعنی زمین سے کاشت کاروں کا انخلا بطریقِ احسن ممکن ہوتا۔ یہ صرف اسی صورت میں ممکن تھا اگر زراعت اور صنعت کے باہمی تعلق کو نگاہ میں رکھتے ہوئے انہیں ایک دوسرے سے مربوط طریقے پر ترقی دینا پیشِ نظر ہوتا۔

دورِ حاضر میں اقتصادی ترقی کا معیار

دورِ حاضر میں اقتصادی ترقی کا معیار یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ صنعت میں منتقل ہوں۔ ایک ماہر اقتصادیات کذنٹ کی رائے کے مطابق اقتصادی ترقی مقصود ہی اس وقت ہوتی ہے جب کسی ملک میں زراعت پیشہ آبادی ساٹھ فیصد سے کم ہونی شروع ہو جائے۔ وہ ساٹھ فیصد یا اس سے اُوپر زراعت پیشہ آبادی رکھنے والے ملک کو پسماندہ اور اس سے کم کاشت کار رکھنے والے کو ترقی پذیر اور جوں جوں یہ شرح کم ہوتی جائے اس نسبت سے اس کو ترقی یافتہ ملک شمار کرتا ہے۔ امریکہ میں جہاں

زراعت پیشہ آبادی مجموعی آبادی کے چھ فی صد سے بھی کم ہے، زراعت سے متعلقہ صنعتوں میں (جو درحقیقت امریکی زرعی نظام کا اہم حصہ بلکہ بنیاد ہیں) کام کرنے والی آبادی پینتیس فیصد ہے جو زراعت کی مضبوط پشت پناہی کر رہی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق وہاں کھیت میں کام کرنے والے ہر کسان کی زرعی ضروریات مثلاً کیمیاوی کھادیں، حشرات کش ادویہ، زرعی مشینری اور دیگر آلات وغیرہ کو پورا کرنے کے لئے تین شخص شہروں کا کام کر رہے ہیں۔ زرعی مارکیٹنگ کے وسیع نظام میں کام کرنے والے لوگوں کی تعداد الگ ہے اور زرعی تحقیق و تفتیش، زرعی تعلیم، زرعی توسیع اور سیڈ کمپنیوں میں کام کرنے والے لوگ ان کے علاوہ ہیں۔ اگرچہ بظاہر ان تمام لوگوں کو "کسان" کہنے کا کوئی جواز نہیں اور زراعت کی قدیم تعریف کے مطابق یہ کسان نہیں کہلاتے لیکن دور حاضر کے پیچیدہ زرعی نظام کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان تمام لوگوں کو کسان ہی شمار کرنا پڑے گا۔

زراعت اور صنعت کا رشتہ

زراعت اور صنعت کے باہم دگر منحصر ہونے کی وجہ سے جدید زراعت میں سائنس اور تکنیکی تبدیلیوں کو لانا اور مؤثر بنانا ایک نہایت پیچیدہ اقتصادی عمل ہے اور اس بات کا اہتمام کرنا ضروری ہے کہ ساتھ ہی ساتھ سماجی ڈھانچے بھی کسی صدمے (SHOCK) کے بغیر تبدیل ہو جائیں۔ دنیائے غرب میں چونکہ زراعت اور صنعت میں سائنس اور تکنیکی تبدیلیاں ایک طویل عرصے پر پھیلی ہوئی مدت میں آہستہ آہستہ رونما ہوئیں۔ اس لئے وہ سماجی ڈھانچے میں آسانی کے ساتھ جذب ہوتی گئیں۔ لیکن ترقی پذیر ممالک میں یہی عمل (جو یورپ اور امریکہ میں صدیوں میں تکمیل پذیر ہوا) جب عشروں میں لانے کی کوشش کی جاتی ہے تو معاشرہ میں دھاکوں اور جھٹکوں کا محسوس ہونا بالکل ایک قدرتی عمل ہے۔ درحقیقت اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک پسماندہ ملک میں صنعتی ترقی کے لئے سارا سرمایہ زراعت ہی کے شعبے سے نچوڑ کر مہیا کیا جاتا ہے۔ کینیتھ بولڈنگ نے اسی لئے تو کہا ہے:

"IT IS THE TURNIP, NOT THE SPINNING JENNY WHICH IS THE FATHER OF INDUSTRIAL SOCIETY."

یعنی "صنعت کا باپ چرخہ نہیں بلکہ شلغم ہے" اور یہ ایک مجبوری ہے جس کی وجہ سے زراعت کے

شعبے میں غربت پلتی ہے۔ دیہی لوگ غربت کے ہاتھوں مجبور ہوتے ہیں کہ وہ شہروں کا رخ کریں۔ لیکن امداد باہمی کے اصول پر پورے کاروبار زراعت کو منظم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے اور اس مشکل میں ان کا جذبۂ ملکیت زمین ہی ان کی زنجیر پا بنتا ہے۔ لیکن اگر وہ ملکیت زمین سے اتنی محبت نہ رکھیں اور زمین کی حدبندی سے محبت کے بجائے اپنے پیشے کو اقتصادی اعتبار سے نفع بخش بنانے کی سعی کریں تو اس مشکل سے نجات کا راستہ نکل سکتا ہے۔ متاع کے تصور میں چونکہ عارضی تمتع کی ذہنیت تشکیل پاتی ہے اس لئے یہ تصور کوآپریٹو فارمنگ کے مزاج سے سازگار رہتا ہے۔ افسوس ہے پاکستان میں تصور متاع کی بنیاد پر زرعی منصوبہ بندی کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔

پیپلز فارمنگ کا منصوبہ

راقم الحروف کے علم کی حد تک پاکستان میں ڈاکٹر عبدالرحیم چودھری پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس تصور کی روشنی میں اس موضوع پر اپنے خیالات شائع شدہ صورت میں پہلی بار پیش کئے۔ موصوف نے مئی ۱۹۵۲ء میں خیرپور سے ایک چھوٹا سا پمفلٹ "پیپلز فارمنگ" (PEOPLES FARMING) کے نام سے انگریزی میں شائع کیا تھا۔ چھتیس صفحات پر مشتمل اس چھوٹے سے کتابچے میں آپ نے ملک میں زراعت کی تنظیمِ نو کا ایک عملی نقشہ قوم کے سامنے رکھا۔ اس پروگرام کی سب سے امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ حکومت کی مالی امداد کے بغیر مقامی وسائل کی تنظیم سے یہ منصوبہ بتدریج نیچے سے اوپر کو بڑھتا تھا اور اپنے مخصوص اسلامی رنگ میں زرعی، اقتصادی، صنعتی، معاشرتی اور تعلیمی ترقی کے زینے طے کرانے کی ضمانت مہیا کرتا تھا۔ افسوس یہ کہ انتہائی مفید منصوبہ ابھی تک عمل کی دنیا میں متشکل نہیں ہو سکا۔ اس منصوبے کے بارے میں راقم الحروف کی جن ماہرینِ زراعت سے بھی گفتگو ہوئی ہے وہ سبھی اس کی افادیت کے تو قائل ہیں لیکن محض اس بناء پر اسے ناممکن العمل خیال کرتے ہیں کہ پاکستانی کاشت کار اپنے جذبۂ ملکیت سے کسی بھی دستبردار ہونے کو تیار نہیں۔ اس لئے منصوبہ میں مجوزہ کوآپریٹو فارمنگ کو نافذ العمل بنانے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ زمین کے ضمن میں قرآن کے تصورِ متاع کے بارے میں علامہ اقبال کے خیالات کو عام کیا جائے تاکہ ان رکاوٹوں کو دور کیا جا سکے اور کاشت کار کھیت کی حدبندیوں پر اصرار

کرنے کے بجائے کوآپریٹو فارمنگ میں انہیں اپنے حصص کی صورت میں رکھنے پر رضا ہو جائیں اور اس ملک میں اسلامی طرز کو آپریٹو فارمنگ کا تجربہ کامیاب ہو سکے۔

جدید زرعی مسائل پر علامہ اقبال کے نظریات کا اطلاق

زراعت ایک معاشی عمل ہے جس میں زمین محنت اور سرمایہ کے بہترین امتزاج اور مؤثر باہمی تعامل سے پیداوار بڑھائی جاسکتی ہے۔ لیکن پیداواری طریقوں کی تبدیلی سے ان وسائل کے باہمی تعامل اور امتزاج کی صورت ہر دور میں بدلتی رہتی ہے۔ ایک وقت تھا کہ زرعی عمل میں زمین کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ کیونکہ اس زمانے میں پیداوار بڑھانے کا صرف ایک ہی طریقہ معلوم تھا اور وہ یہ تھا کہ زیر کاشت رقبہ بڑھایا جائے۔ یعنی جہاں ایک ایکڑ زمین سے دس من گندم پیدا ہوتی تھی وہاں بیس من گندم پیدا کرنے کا واحد طریقہ یہی تھا کہ دو ایکڑ میں گندم کاشت کر دی جائے۔ رفتہ رفتہ زراعت میں ہنرمندی کا دور شروع ہوا جس میں کاشت کار کے تجربے اور محنت کو اہمیت حاصل ہوئی۔ ایک مشہور اور قدیم لوک کہانی میں جس بوڑھے دہقان نے مرتے وقت اپنے بیٹوں کو کھیت میں خزانہ دفن ہونے کی خبر دے کر بالواسطہ "دب کے واہ رج کے کھا" کا عملی سبق ذہن نشین کرایا تھا وہ یقیناً اس دور کا ایک ترقی پسند کاشتکار تھا لیکن بیسویں صدی میں زراعت ایک فن اور ہنر کی بجائے ایک سائنس اور صنعت کی حیثیت اختیار کر گئی ہے جس میں پیداوار بڑھانے کے لئے" دب دب کے واہ بیلیا" کا سادہ نسخہ بڑی حد تک اپنی عملی افادیت کھو چکا ہے اور فصلوں کی نئی اقسام کے بیجوں اور مصنوعی کھادوں کے استعمال کی وجہ سے زرعی پیداوار بڑھانے کی جہت اب افقی کے علاوہ عمودی ہو گئی ہے۔ ترقی یافتہ زراعت کا مسئلہ اب ہرگز یہ نہیں ہے کہ زمین پر زیادہ سے زیادہ کاشت مشقت کریں بلکہ یہ ہے زمین سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو" بیدخل "کرکے زرعی پیداوار کو صنعتی اصولوں پر بڑھایا جائے۔ چنانچہ ترقی پذیر زراعت میں "جیہڑا واہوے اوہو کھاوے" کے اصول پر اصرار فنی اور تکنیکی اعتبار سے ترقی کی راہ میں زبردست رکاوٹ شمار کیا جاتا ہے۔

صنعتی زراعت کے اثرات

سائنس اور صنعتی زراعت سے کیا مراد ہے؟ اس کا تصور واضح کرنے کے لئے یہاں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی مثال کا بیان ضروری ہوتا ہے جو سائنس اور صنعتی زراعت کا پیشرو ملک شمار ہوتا ہے اور جہاں زراعت حقیقی معنوں میں اور مکمل طور پر صنعت بنتی جا رہی ہے۔ ۱۹۳۷ء میں ایک امریکی کاشتکار صرف دس افراد کی خوراک پیدا کر سکتا تھا۔ ۱۹۵۰ء میں وہ پندرہ افراد کی خوراک پیدا کرنے کے قابل تھا اور ۱۹۵۹ء میں وہ چوالیس افراد کی خوراک پیدا کرنے پر قادر تھا۔ اس کی کارکردگی میں یہ نمایاں فرق ان فنی اور تکنیکی تبدیلیوں کا نتیجہ ہے جو زراعت میں رونما ہوئیں بلکہ یوں کہئے کہ اب زراعت کا حصہ بن چکی ہیں۔ زراعت میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے عمل دخل کا یہ عالم ہے کہ اب ایسے خود کار ٹریکٹر ایجاد کئے جا چکے ہیں جن کو چلانے کے لئے کسی ڈرائیور کی ضرورت نہیں بلکہ کاشتکار اپنے گھر کے کسی آرام دہ حصے میں ایک کنٹرول روم میں بیٹھ کر ریڈیائی کنٹرول کی مدد سے کھیت میں چلا سکتا ہے اور کنٹرول روم میں کھیتوں اور فصلوں کے نقشوں کی مدد سے گھر میں بیٹھے بیٹھے ہل چلانے، بیج بونے اور نلائی اور کٹائی کرنے کے تمام کام مشینوں کے ریڈیائی کنٹرول ہی سے انجام پا سکتے ہیں۔ اس طرح ایسی مشینیں بھی ایجاد ہو چکی ہیں جن کی مدد سے پچھتر ہزار مرغیوں یا پانچ ہزار مویشیوں کو خوراک کھلانے اور ان کی نگہبانی کرنے کا پورا کام صرف ایک آدمی تن تنہا انجام دے سکتا ہے۔ ان فنی اور تکنیکی دریافتوں کا یہ نتیجہ ہے کہ ہر سال تیس لاکھ دیہی افراد دیہات چھوڑ کر شہروں کا رخ کر رہے ہیں۔ چنانچہ امریکہ کی ستر فیصد آبادی شہروں میں، جو ملک کے رقبہ کا صرف ایک فیصد ہے، سمٹ آئی ہے جب کہ ننانوے فیصد رقبہ میں صرف تیس فیصد آبادی سکونت پذیر ہے۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء کے دس سالہ عرصہ میں نو لاکھ فارم اقتصادی اعتبار سے غیر نفع بخش ہونے کے باعث اپنا الگ وجود برقرار نہ رکھ سکے اور ملحقہ بڑے بڑے فارم انہیں ہڑپ کر گئے۔ اس وقت وہاں کاروباری طرز کے بڑے بڑے فارموں کی تعداد تیس لاکھ ہے اور اندازہ لگایا گیا ہے کہ آئندہ دس سال میں ان کی تعداد نصف رہ جائے گی۔ اس طرح کاشتکاروں کی تعداد میں بھی بیس لاکھ کی کمی ہو جائے گی۔ اگرچہ وہاں فارم کا اوسط رقبہ ساڑھے تین سو ایکڑ سے کم نہیں اور نجی ملکیتوں پر مشتمل بڑی بڑی زمینداریاں جنہیں زرعی کارخانوں (FACTORIES ON - THE - FARM) کا نام دیا جاتا ہے، موجود ہیں۔

لیکن اس کے باوجود نجی ملکیتوں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جارہی ہے۔ چند سال پیشتر وہاں زرعی اقتصادیات اور فارمی کاروبار کے ایک بڑے ماہر وائن ایکن نے پیش گوئی کی تھی کہ بیس سال بعد امریکہ میں خاندانی طرز کا ایک فارم بھی نہیں رہے گا کیونکہ زرعی کاروبار میں (زرعی مشینری، کھادوں اور مؤثر دواؤں پر) اخراجات اس تیزی سے بڑھتے جارہے ہیں کہ بڑے سے بڑے سرمایہ دار زمیندار کے لئے بھی یہ ممکن نہیں ہوگا کہ وہ تن تنہا ان اخراجات کا متحمل ہو سکے۔ اس لئے ملک بھر میں زراعت کا کاروبار بڑی بڑی کمپنیاں سنبھال لیں گی۔ اس وقت بھی ایک صنعتی یونٹ کے مقابلے میں زرعی یونٹ پر کہیں زیادہ سرمایہ کاری درکار ہے۔ علاوہ ازیں زراعت میں روز افزوں تخصص و مہارت کا یہ عالم ہے کہ ایک جائزے کے مطابق وہاں ایک اوسط درجے کے فارم پر کسان کو ایک سال کے عرصے میں زرعی نوعیت کے پانچ ہزار فیصلے کرنے پڑتے ہیں جن کے لئے وہ تازہ ترین سائنسی معلومات کا متلاشی رہتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں کاشت کاروں اور کھیتوں کی تعداد میں سال بہ سال کمی کے باوجود بھی محکمہ زراعت کے کارکنوں کی تعداد میں ہر سال اضافہ کیا جارہا ہے۔ ٹائم (۱۵ اپریل ۱۹۶۳ء) میں ایک واقعہ بطور لطیفہ شامل ہوا تھا کہ امریکہ کے ایوان نمایندگان میں مشن گن کے ریپبلکن ممبر رابرٹ گرفن نے ازراہِ تفنن ایک قرارداد پیش کی جس میں اس یقین دہانی کا مطالبہ کیا گیا تھا کہ محکمہ زراعت کے ملازمین کی مجموعی تعداد کو کاشتکاروں کی مجموعی تعداد سے بڑھنے نہیں دیا جائے گا۔ لیکن یہ تحریک ۲۳۰ ووٹوں کے مقابلے میں صرف ۱۷۱ ووٹ حاصل ہونے کی بنا پر مسترد ہوگئی۔ محکمہ زراعت کے اس پھیلاؤ کے باوجود امریکی کاشتکار ابھی تک محکمہ زراعت کے معلومات رسانی کے کام سے پوری طرح مطمئن نہیں ہیں۔ زراعت میں سائنس اور فنی تخصص و مہارت کی اس کیفیت کے پیش نظر امریکہ کے سرکاری سالنامہ زراعت ۱۹۷۰ء YEAR BOOK OF AGRICULTURE, 1970 میں یہ پیش گوئی کی گئی ہے کہ آئندہ دس سال میں زرعی ماہرین اور کاروباری منتظمین کی کھپت کے امکانات روشن ہیں لیکن زمیندار یعنی مالکانہ حقوق رکھنے والے کاشت کاروں کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی بلکہ زراعت میں سرمایہ کاری کے روز افزوں رجحان کے پیش نظر کاروبار زراعت میں بھی صنعتی اور کاروباری کمپنیوں کی طرح حصص خریدنے کا رواج بہت عام ہو جائے گا۔

ایک تصویر کے دو رُخ

امریکہ کی مثال کو اس قدر وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کا مقصد اس بات کو واضح کرنا تھا کہ انفرادی آزادی کے اس سب سے بڑے دعویدار ملک میں بھی عملاً وہی کچھ ہو رہا ہے جو اجتماعیت و اشتراکیت کے علمبردار ممالک میں ہو چکا ہے۔ یہ بات کس قدر دلچسپ ہے کہ اشتراکی ممالک (روس اور چین) میں نظریاتی وجوہ کی بنیاد پر اور نیشنلائزیشن کے نام پر زمین سے بیدخل کیا جاتا رہا ہے اور آزادئ فرد کے علمبردار سرمایہ دار ملک میں یہی کام طریق پیداوار میں تبدیلی کی بنا پر سائنس اور ٹیکنالوجی سرمایہ اور مشینیں انجام دے رہی ہیں۔ زمین کے مالکانہ حقوق سے کاشتکار یہاں بھی بے دخل ہو رہا ہے اور وہاں بھی نتائج کے اعتبار سے دونوں میں ہرگز کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کہیں سیاسی نظریات اسے مالکانہ حقوق سے محروم کر رہے ہیں اور کہیں سائنس اور ٹیکنالوجی کا سرمایہ کارانہ رجحان اسے چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔ زمین کی ملکیت کا تصور دونوں قسم کے ممالک سے معدوم ہوتا جا رہا ہے۔ مطلق تعداد کے اعتبار سے دیکھا جائے تو دنیا بھر میں زمینداروں کی تعداد میں کمی ہو رہی ہے اور جاپان، ڈنمارک اور نیدرلینڈ جیسے ممالک میں بھی جہاں زمینی ملکیتیں بہت چھوٹی ہیں اور زرعی پیداوار بڑھانے کے لئے ایسی ٹیکنالوجی پیدا کی گئی ہے جو چھوٹے چھوٹے کھیتوں میں بھی زیادہ سے زیادہ پیداوار دینے کی صلاحیت رکھتی ہے یہی رجحان کارفرما ہے یعنی زمین سے کاشتکاروں کے اخراج و انخلا کا عمل تیزی سے جاری ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ زمینی ملکیت کا تصور مختلف تاریخی قوتوں کے زیر اثر ناپید ہوتا جا رہا ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل گوشوارے سے ظاہر ہے۔

گوشوارہ نمبر ۱

نام ملک یا برِ اعظم	مجموعی آبادی میں کسانوں کا تناسب ۱۹۵۰ء	۱۹۶۵ء
ایشیا (چین کے علاوہ)	۶۴ فیصد	۶۵ فیصد
چین	۶۹ "	۶۳ "
روس	۵۰ "	۳۲ "

افریقہ	۷۶ ″	۷۴ ″
یورپ	۳۳ ″	۲۳ ″
اوقیانوسیہ (بحراوقیانوس کے ممالک آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، فجی اور دوسرے جزائر)	۲۲ فیصد	۱۹ فیصد
وسطی امریکہ	۲۴ ″	۱۶ ″
شمالی امریکہ	۱۴ ″	۶ ″
جنوبی امریکہ	۵۹ ″	۵۶ ″
ریاست ہائے متحدہ امریکہ	۱۵ ″	۶ ″
پوری دُنیا	۵۶ ″	۵۲ ″

گوشوارہ نمبر ۲

نام ملک	مجموعی آبادی میں کسانوں کا تناسب
پاکستان	۷۴ فیصد
جاپان	۲۷ ″
تیوان	۴۷ ″
اسرائیل	۱۲ ″
ڈنمارک	۱۵ ″
نیدرلینڈ	۹ ″
بلجیم	۶ ″
ہنگری	۳۱ ″
یوگوسلاویہ	۵۳ ″
برطانیہ	۴ ″
آسٹریلیا	۱۰ ″
کینیڈا	۱۱ ″

ان دونوں گوشواروں سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ دنیا بھر کے زمیندار اور کاشتکاروں کی تعداد کم ہو رہی ہے اور زراعت پیشہ آبادی میں کمی کے ساتھ ساتھ زراعت میں سرمایہ کاری کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ مثال کے طور پر امریکہ میں ۱۹۶۰ء میں زرعی شعبہ میں فی کاشتکار ایک لاکھ روپیہ سرمایہ درکار ہوتا تھا جب کہ ۱۹۷۰ء میں یہ شرح بڑھ کر فی زرعی مزدور ڈھائی لاکھ روپیہ کو پہنچ چکی ہے۔

زراعت میں سرمایہ کاری کی ضروریات صرف انہی ممالک میں نہیں بڑھ رہیں جہاں زرعی املاک بہت بڑی بڑی ہیں بلکہ ان ممالک میں بھی جہاں یہ املاک چھوٹی چھوٹی ہیں، یہی رجحان کارفرما ہے مثلاً ڈنمارک کی زراعت میں ۶۰-۱۹۵۰ء کے دوران میں زرعی مشینوں کی کل مالیت میں پچاس فیصد اضافہ ہوا اور اب بھی ان پر سالانہ سرمایہ کاری کی شرح چالیس فیصد کے حساب سے بڑھتی جا رہی ہے۔ اس طرح جاپان میں جہاں زراعت پیشہ آبادی روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔ سرمایہ کاری کی ضروریات بتدریج بڑھ رہی ہیں۔ جاپان میں ۱۹۵۰ء میں کاشتکاروں کی تعداد ۴۷ فیصد تھی جب کہ ۱۹۶۷ء میں یہ تعداد کم ہو کر صرف ۲۳ فیصد رہ گئی اور اس پورے عرصے میں آٹھ لاکھ افراد ہر سال زرعی شعبہ سے صنعتی شعبہ میں منتقل ہوتے رہے۔ لیکن مشینوں کی روز افزوں ترویج کا یہ عالم ہے کہ ۱۹۵۰ء میں وہاں صرف بارہ ٹریکٹر تھے۔ ۱۹۶۰ء میں ان کی تعداد ساڑھے چار ہزار تھی جب کہ ۱۹۶۳ء میں ان کی تعداد سترہ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ قطعات اراضی چھوٹے چھوٹے ہونے کی وجہ سے وہاں زراعت کا پیشہ اس قدر کم نفع بخش اور غیر اقتصادی ہو گیا ہے کہ کاشت کاروں کا انحصار زراعت پر روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے اور وہ زراعت کو صرف جز وقتی پیشہ کے طور پر اپنانے پر مجبور ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں قریباً اسی فیصد زراعت پیشہ خاندان زراعت کو صرف جز وقتی پیشہ کے طور پر ہی اپنائے ہوئے تھے اور ان کی آمدنی کا ۵۰ فیصد غیر زرعی شعبوں سے حاصل ہوتا تھا۔

ہمارے زرعی مسائل

زراعت میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے عمل دخل کے اثرات اور جدید طرز کی زراعت میں سرمایہ کاری کی اہمیت کو واضح کرنے کے بعد ہم اصل مسئلہ زیر بحث کی طرف لوٹتے ہیں۔ پاکستان بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے اور اس کی معیشت میں زراعت کی مرکزی حیثیت سے انکار ممکن نہیں زراعت

کو ترقی دے کر ہی ملکی معیشت کو مضبوط بنایا جا سکتا ہے۔ یہ حقیقت بھی محتاج بیان نہیں کہ یہاں انسانی آبادی روز افزوں اور زمین کا رقبہ محدود ہے۔ صرف ایک سال ہی میں پاکستان کی آبادی میں ناروے کی مجموعی آبادی کے برابر اضافہ ہو جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں پاکستان ہر سال ایک چھوٹی سی قوم کو جنم دیتا ہے۔ ظاہر ہے بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریات خوراک و پوشاک بھی مسلسل بڑھ رہی ہیں۔ زمینی وسائل محدود ہونے کی مجبوری کے ساتھ زرعی پیداوار کو بڑھانے کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ سائنس اور ٹیکنالوجی سے پورا پورا استفادہ کیا جائے۔ لیکن زراعت میں سائنسی اور تکنیکی تبدیلیوں کی وجہ سے اس پیشے میں سرمایہ کاری کی ضروریات روز افزوں ہیں جن کی وجہ سے عام کاشتکاروں کے لئے یہ ممکن نہیں رہتا کہ وہ اپنے چھوٹے قطعات اراضی پر مناسب سرمایہ کاری کر کے اپنی پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ کر سکیں۔ مثال کے طور پر گندم، چاول اور مکئی کی نئی اقسام جو اس ملک کی زراعت میں "تبدیلی کے انجن" (ENGINES OF CHANGE) ثابت ہو رہی ہیں اپنے ہمراہ سرمایہ کاری کے متعدد رجحانات لاتی ہیں۔ ان کی کامیاب کاشت کے لئے پانی زیادہ، کھادیں زیادہ، حشرات کش ادویہ کا استعمال اور کسی حد تک مشینی طریق کاشت کا اپنانا ناگزیر ہے اور یہ تمام چیزیں سرمایہ طلب ہیں۔ درحقیقت سائنس اور تکنیکی طرز زراعت ایک صنعتی کاروبار ہے جس میں مناسب سرمایہ کاری کے بغیر کامیابی محال ہے۔ مثلاً گندم ہی کو لیجئے، محکمہ زراعت مغربی پاکستان کے شعبہ مارکٹنگ اور زرعی اقتصادیات کے ایک اندازے کے مطابق دیسی گندم کاشت کرنے کی صورت میں فی ایکڑ ۳۱۴ روپے اور ۳۸۶ روپے آمدنی ہوتی ہے۔ جب کہ گندم کی نئی قسم میکسی پاک کاشت کرنے سے ۴۳۲ روپے لاگت اور ۷۰۲ روپے آمدن اٹھتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص فی ایکڑ معمولی بہ اخراجات سوسوا سوا روپیہ زیادہ کرنے کے قابل ہے وہ تو ۲۶۹ روپے منافع کماتا ہے لیکن جو استطاعت نہیں رکھتا اس کی آمدن ۶۷ روپے سے آگے نہیں بڑھ سکتی اور وہ محض اپنی غربت کی مجبوری سے دوسو روپے کے زائد منافع سے محروم رہ جاتا ہے۔ یعنی ایک متمول کاشتکار صرف سوسوا سو روپیہ فی ایکڑ زائد خرچ کر کے ۶۲ فیصد منافع کماتا ہے۔ لیکن ایک غریب کاشتکار ۲۱ فیصد سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ غرض یہ کہ نئی تکنیکی تبدیلیاں سرمایہ طلب ہونے کی وجہ سے پہلے پہل صرف متمول کاشتکاروں ہی کی دسترس میں آتی ہیں اور وہ انہیں اپنانے میں سبقت کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ ہر نئی تکنیکی تبدیلی کی اقتصادی نفع بخشی سے اس وقت تک مستفید ہوتے رہتے ہیں تا آنکہ ان کے عام ہو جانے سے پیداوار میں اضافے کی وجہ سے قیمتیں گرنے لگتی ہیں۔ اس وقت

قلیل الوسائل کاشتکار جو اپنی کم علمی یا قلت سرمایہ کی وجہ سے اس نئی تکنیکی تبدیلی کو اپنانے سے قاصر رہے دوہرے خسارے میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یعنی تکنیکی تبدیلی سے استفادہ نہ کر سکنے کی وجہ سے وہ پیداوار کو تو بڑھا نہیں سکتے لیکن جب ملک کی مجموعی زرعی پیداوار میں اضافے کی وجہ سے قیمتیں گرنے لگتی ہیں تو اس کا نقصان انہیں ضرور پہنچتا ہے۔ اس ساری بحث کو ایک جملے میں یوں سمیٹا جا سکتا ہے کہ نئی ٹیکنالوجی میں زراعت میں سرمایہ کاری کو فروغ دے کر امیر کاشتکاروں کو امیر تر اور غریب کاشتکاروں کو غریب تر بنا دیتی ہے۔ چنانچہ نئی ٹیکنالوجی کے انہی مضمرات کے پیش نظر اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل اوتھان نے گذشتہ سال متنبہ کیا تھا کہ پاکستان، ہندوستان اور دوسرے ترقی پذیر ممالک میں جس سبز انقلاب کی خوشخبری سنائی جا رہی ہے خطرہ ہے کہیں وہ سرخ انقلاب میں تبدیل نہ ہو جائے۔

زراعت کے صنعت بن جانے سے زرعی شعبے میں بھی معاشی انصاف کا مسئلہ شدت سے ابھر آیا ہے۔ جب تک زرعی پیداواری طریقوں میں زمین انسانی محنت اور توجہ کے عوامل کارفرما رہے اور زراعت میں جب تک تمام کام انسان کی شخصی توجہ اور محنت کے محتاج رہے جذبۂ ملکیتِ زمین کو برقرار رکھنا اور اسے قانونی تحفظات دینا نہایت ضروری تھا۔ لیکن آج کے سائنسی دور میں جب کہ زرعی پیداوار کو بڑھانے کیلئے کھیت میں انسانی محنت کی جگہ فولادی محنت یعنی ٹریکٹر اور انسانی ذہن کی جگہ مشینی ذہن یعنی کمپیوٹر لے رہے ہیں اور انسان زمین سے کہیں دور پیچھے کی طرف سرکتا جا رہا ہے۔ ملکیتِ زمین پر اصرار زرعی ترقی کے لئے زنجیر پا بن گیا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں چھوٹے چھوٹے قطعات پر زراعت کو صنعتی بنیادوں پہ قائم کرنے کی گنجائش نہیں رہتی۔ دوسری طرف جب زراعت کو صنعتی طرز پر منظم کیا جاتا ہے تو معاشی انصاف کا مسئلہ وبالِ جان بن جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ زراعت کی نئی تنظیم میں ان دونوں مقاصد میں باہم تطبیق اور ہم آہنگی کیونکر پیدا کی جائے۔

زراعت کی تنظیم نو کا ایک طریقہ تو وہ ہے جو اشتراکی ممالک نے اختیار کیا ہے یعنی زمین کو قومی ملکیت قرار دینے کا انقلابی اقدام لیکن جمہوری ممالک میں جہاں زراعت کی تنظیم کو معاشی قوانین کے قدرتی عمل پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ زرعی تنظیم ارتقائی طور پر ایک طویل عرصے میں بتدریج تکمیل پاتی رہتی ہے تیسری صورت یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے کاشتکار برضا و رغبت چھوٹے چھوٹے قطعات کو یکجا کر کے اسلامی اصولوں پر کوآپریٹو فارمنگ کو ترجیح دیں۔ کوآپریٹو فارمنگ کے راستے میں اس وقت سب سے بڑی مشکل

یہ ہے کہ ہمارا کاشت کار ملکیتِ زمین کے تصور سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں۔ زمین سے پاکستانی کاشت کاروں کی محبت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ کومیلا (مسلم بنگال) میں ٹریکٹروں کے استعمال کو مقبول بنانے کے لئے ۱۹۶۰ء میں کوآپریٹو تحریک کا جو تجربہ کیا گیا اس کے لئے یہ صورت اختیار کی گئی کہ چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں کو یقین دلایا جاتا تھا کہ ان کی ملکیت سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا جائے گا۔ اس کیلئے یہ اہتمام کیا گیا کہ ٹریکٹر چلانے سے پہلے چوبی میخیں گاڑ کر اپنے اپنے کھیتوں کی حد بندی کی نشاندہی کر لیتے تھے اور ٹریکٹر چلانے کے بعد از سرِ نو اپنے کھیتوں کی وٹیں دوبارہ قائم کر لیتے۔ یہ تجربہ اتنا نرالا اور انوکھا تھا کہ اس کا چرچا پوری دنیا میں ہوا لیکن غور سے دیکھا جائے تو اس تجربے کی کامیابی کو کامیابی شمار کرنا ہی غلطی ہے کیونکہ اس میں کوآپریٹو فارمنگ کے راستے کی اصل رکاوٹ (یعنی ملکیتِ زمین کا ایسا تصور جو زمین سے معاشی ضروریات پوری کرنے کے بجائے زمین پیوندی پر مبنی ہو) کو دور نہیں کیا گیا۔ اس رکاوٹ کو دور کرنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ زمین کے "متاع" ہونے کی قرآنی تصور کو عام کرنے کے لئے ایک زبردست تعلیمی تحریک چلائی جائے اور کاروبار زراعت کے کوآپریٹو اداروں میں اپنی اپنی ملکیت کو بطور حصص رکھنے کے خیال کو مقبول بنایا جائے۔ کاشتکاروں پر یہ بات واضح کرنے کی سخت ضرورت ہے کہ جدید زراعت میں سرمایہ کی روز افزوں احتیاج کاشت کاری کو انفرادی پیشہ کی حیثیت سے ختم کر رہی ہے۔ اسلئے انہیں رضاکارانہ طور پر امداد باہمی کے اسلامی اصولوں پر ایسے ادارے اور تنظیمیں قائم کرنی چاہئیں جن سے زراعت کو زیادہ سے زیادہ پیدا آور بنایا جا سکے۔ امداد باہمی کے اصولوں پر زرعی انجمنوں کا قیام اور اجتماعی خطوط پر کھیتی باڑی کی تنظیم مسلمانوں کے لئے کوئی نیا خیال نہیں۔ اس کے نظائر خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائے۔ جس وقت آپ نے مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی اس وقت مدینہ منورہ کے اردگرد سب کی سب زرعی آبادیاں تھیں۔ اس لئے آپ نے مدینہ منورہ پہنچتے ہی زرعی آبادیوں کو از سرِ نو تنظیم کیا۔ مردم شماری کرائی اور مہاجرین وانصار کے درمیان مواخات قائم کر کے اراضی کو اس طرح تقسیم فرمایا کہ مہاجرین انصار مشترکہ طور پر کاشت کاری کریں۔ اشتراک کی صورت یہ تھی کہ ایک ایک مہاجر اور ایک ایک انصاری کا گروپ تشکیل دے کر ایک ایک یونٹ اراضی ان کی تحویل میں دے دی گئی جس کا نام شاطہ رکھا گیا۔ شاطہ پر کھیتی باڑی کا کام باری باری سے انجام پاتا تھا جس کی رو سے ایک روز مہاجر زمین پر کام کرتا اور انصاری تعلیم حاصل کرتا یا دوسرے دینی کام انجام دیتا اور دوسرے

روز انصاری کھیتی باڑی کرتا اور انصاری تعلیم حاصل کرتا اور مہاجر دوسرے کام سرانجام دیتا۔ مثلاً کنواں کھودنا بند باندھنا وغیرہ۔ علاوہ ازیں آپ نے بڑے بڑے زرعی منصوبوں کے لئے علاقہ کے نام سے زرعی تنظیمیں قائم کیں جو امداد باہمی کے اصولوں پر کام کرتی تھیں اور اس نقشہ پر پورا انظام ملکیت نقابت، عرافت، نظارت اور عمالت میں درجہ وار تقسیم فرمایا۔

اسلام اور متاع کا حرکی تصوّر

غرض یہ کہ اسلام میں زمین کے بارے میں ملکیت کا کوئی جامد تصوّر نہیں پایا جاتا بلکہ "متاع" کا حرکی تصوّر ملتا ہے جو ہر دَور کے بدلتے ہوئے تقاضوں کو بخوبی پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس انتہائی اہم نکتہ کی وضاحت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کا ایک دل پسند موضوع تھا۔ جس پر آپ نے بار بار زور دیا ہے۔ مولوی محمد تقی امینی اپنی کتاب "اسلام کا زرعی نظام" کے آخر میں لکھتے ہیں :

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے کرام کے زمانہ میں حق ملکیت کی حیثیت حق استعمال اور حق انتفاع سے زیادہ نہ تھی اور مفاد عامہ کی خلاف ورزی کی صورت میں انفرادی حق پائمال کئے بغیر خلافت کو ہر قسم کے صَرف کا اختیار حاصل تھا۔ اس میں حقوقِ ملکیت کا "گورکھ دھندا" حائل ہوتا نہ کچھ اور۔"

موجودہ زمانے میں زراعت ایک نہایت ہی پیچیدہ اور متغیّر معاشی عمل ہے جس کے موثرات اور عوامل کے بیان میں زمین کی ذرخیزی سے لے کر کسان کے ذہن کی ذرخیزی تک ایک ایک بات کا تذکرہ درکار ہے۔ اقتصادیات کے ایک بہت بڑے ماہر شلٹز (SHULTZ) کا قول ہے کہ کسی ملک کو جدیدترین سٹیل مل لگانے کا طریقہ بتلانا بہت سہل ہے لیکن زرعی ترقی کے بارے میں صحیح مشورہ دینا سخت مشکل کیونکہ یہاں تو" زہجر تا بہ وصالش ہزار فرسنگ است" والا معاملہ ہے۔ مثال کے طور پر اگر یہ کہا جائے کہ سڑک کی تعمیر سے زرعی پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے تو شاید یقین نہ کیا جائے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ تھائی لینڈ میں "شاھراہ دوستی" (FRIENDSHIP HIGHWAY) نامی ایک سو میل لمبی سڑک کی تعمیر سے صرف تین سال کے مختصر عرصہ میں وہاں گنا، گیلا اور دوسرے پھلوں کی پیداوار تین گنا بڑھ گئی اور تھائی لینڈ نے جاپان کو مکئی کی فاضل پیداوار برآمد کرنی شروع کر دی۔ زرعی اقتصادیات کے ماہرین نے مختلف ممالک

کی زرعی ترقی کا تجزیاتی مطالعہ کرنے کے بعد زراعت کی ترقی کے جو اجزائے ترکیبی گنوائے ہیں ان کی اہمیت مختلف ممالک کے لئے مختلف ہے۔ زراعت کے پیداواری طریقوں میں انقلابی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ بعض اداراتی (INSTITUTIONAL) تغیرات (مثلاً زمین اور کسان کے قانونی رشتوں میں تبدیلی) ناگزیر ہو گئے ہیں۔ جس کے لئے کسان کے ذہن کو تبدیل کرنا درکار ہے۔ چنانچہ کسان کی "ذہنی زرخیزی" کے لئے جس قسم کی ذہنی کھاد درکار ہے اس میں فنی معلومات (TECHNICAL INFORMATION) اور تحریک (MOTIVATION) دونوں شامل ہیں۔ اس بات پر جتنا بھی زور دیا جائے کم ہے کہ پیداواری طریقوں کی تبدیلی کاشتکار کی ذہنی تبدیلی کی مقتضی ہے لیکن ذہنیت کی تبدیلی بسا اوقات نظریۂ حیات کی تبدیلی پر بھی منتج ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر اس صدی کے شروع میں جاپان میں مغربی سائنس سے استفادہ کرنے کے لئے "مغربی ٹیکنالوجی اور مشرقی اقدار" کا نعرہ لگایا گیا لیکن جب مغربی ٹیکنالوجی نے وہاں پوری طرح قدم جما لئے تو منکشف ہوا کہ وہاں مغربی اقدار حیات بھی ترویج پا چکی ہیں چنانچہ جاپان کے قومی ناول نگار سوسیکی ناٹشوما (SOSEKI NATSUMA) نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ اس کے ناولوں کا مرکزی فکر یہ ہے کہ جاپان نے جدیدیت کو عجلت سے اپنایا اور اس کے نتیجے میں ایک ایسا انتہائی سطح بیں معاشرہ معرض وجود میں آیا جس کی بنیاد ہی دھوکے پر ہے۔

جدید ٹیکنالوجی کے نفوذ سے زراعت کے پیداواری طریقوں میں انقلابی تبدیلیاں کھیت کی حدبندی میں وسعت پذیری اور وسعت طلبی کی مقتضی ہیں اور ان کی وجہ سے زمین اور کسان کا قانونی رشتہ یعنی تصوّر ملکیت (جو درحقیقت اس کے معاشی مفادات کے تحفظ کی ایک تدبیر کے طور پر پیدا ہوا تھا) متاثر ہو رہا ہے۔ نیز زراعت میں سرمایہ کاری کی روز افزوں ضروریات امیر کاشت کاروں کو امیر اور غریب کاشت کاروں کو غریب تر بنائے دے رہی ہے۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ زمین کی پیداوار میں اضافہ ہو۔ معاشرہ میں معاشی انصاف کے تقاضے پورے ہوں اور مرد کو ایسی آزادی حاصل رہے کہ وہ اخلاقی جدوجہد میں زیادہ سے زیادہ حصہ لے سکے۔ ان سہ گونہ مقاصد کے حصول میں زمین کو قومی ملکیت قرار دینا ممکن ہے کہ مسئلہ کا اقتصادی حل ہو لیکن انسانی اور اخلاقی حل ہرگز نہیں ہے۔ نیز بڑا خطرہ اس حل کے اپنانے میں یہ ہے کہ اس کے واسطے سے ایک ایسے نظریۂ حیات کو یہاں قدم جمانے کا موقع مل جائے گا جسے آپ جو نام دینا چاہیں دے لیں لیکن اسلام ہرگز نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے علامہ اقبال جن کے

فکر کا سرچشمہ اسلام اور صرف اسلام ہے ایسے اقدام کے داعی اور موید نہیں ہو سکتے تھے۔ آج کل جو کہا جا رہا ہے کہ علامہ اقبال زمین کو قومی ملکیت میں دینے کے زبردست داعی تھے صرف کذب و افترا ہے بلکہ ان کی بنیادی فکر کے منافی ہے۔ درحقیقت علامہ اقبال کے بارے میں یہ غلطی دو وجہ سے پیدا ہوئی۔ ایک تو یہ ہے کہ آپ نے دہقان کی مظلومیت سے متاثر ہو کر سخت تند و تیز اشعار کہے ہیں جن کا اثر انگیزی اور جذباتی تحریک سے آج کل ناجائز سیاسی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ دوسرے یہ کہ آپ نے زمین کے سلسلے میں ملکیت کے تصور کی نفی کر کے متاع کے تصور پر زور دیا ہے لیکن زمین کے تصورِ متاع پر علامہ اقبال کے اصرار سے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انفرادی ملکیت کے تصور کی نفی کر کے قومی ملکیت کے تصور کو اپنا لیا جائے۔ نہ ہی الارض للہ کا یہ مطلب ہے کہ "زمین حکومت کی ملکیت ہے"۔ اللہ کے معنی حکومت نہیں ہیں البتہ جو حکومت اللہ کی رضی کو پورا کرنے کی ذمہ داری کو قبول کرے اسے مفاد عام میں زمین کے بارے میں ہر قسم کے تصرف کا حق ہوگا۔

جس طرح پانی، ہوا اور روشنی کے مسائل جن پر پوری انسانیت کی بقا کا انحصار ہے کسی کی ملکیت نہیں ہو سکتے اسی طرح زمین بھی خوراک پیدا کرنے کا ذریعہ ہونے کے اعتبار سے کسی کی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ تاریخ انسانی کے ابتدائی دور میں جب انسان اپنی خوراک جنگل کے پھلوں سے حاصل کرتا تھا تمام زمین "آب و نانِ ماست از یک مائدہ" کے مصداق انسانوں کی مشترکہ ملکیت تھی۔ زراعت کی ایجاد سے انفرادی ملکیت کی احتیاج پیدا کی تاکہ کوئی طاقتور شخص کسی کمزور شخص کو محض قوت کے بل بوتے پر بیدخل کر کے اس ذریعہ کو چھین نہ سکے۔ چنانچہ ابتداً حق ملکیت حق تمتع کو تحفظ دینے کے لئے پیدا ہوا اور اسے قانونی حیثیت دی گئی۔ لیکن رفتہ رفتہ اس ملکیت کی نوعیت بدلتی گئی اور یہ حق مستقل ملکیت کے ایسے جامد تصور میں تبدیل ہو گیا کہ "زمین جنبد نہ جنبد گل محمد"۔ اب تمتع اور انتفاع کے بجائے زمین پیوندی پر مبنی قبضہ اور اختیار کو بنیادی اہمیت حاصل ہو گئی اور ایسا تصور ملکیت معرض وجود میں آیا جس کی رو سے ایک جاگیردار کو یہ حق ملا کہ وہ جتنی اراضی چاہے اپنے قبضے میں رکھے خواہ وہ اسے استعمال میں لاتا ہو اور اس سے خواہ کتنے ہی لوگوں کی روزی کیوں نہ متاثر ہوتی ہو۔ حالانکہ زمین ایک ایسا قدرتی وسیلہ ہے جس سے تمام انسانوں کی غذائی ضروریات پوری ہونی چاہئیں۔ علامہ اقبال جب زمین کے بارے میں فرماتے ہیں۔

ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت

یا

باطن الارض للّٰہ ظاھر است
ہر کہ این ظاہر نہ بیند کافر است

تو وہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہوتے ہیں۔

دوگونہ مشکلات

موجودہ زمانے میں اس مسئلہ نے ایک اور پیچیدگی اختیار کر لی ہے۔ ایک طرف تو جاگیردار ہیں جو وسیع و عریض اراضیات کو محض قوت کی علامت کے طور پر اپنے قبضے میں رکھنا چاہتے ہیں اور اس وسیلہ رزق پر قابض رہ کر مفادِ عامہ کے راستے میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں اور دوسری طرف چھوٹے چھوٹے کاشتکار ہیں جو زمین سے پوری پیداوار حاصل کرنے پر قادر نہ ہونے کے باوجود کھیتوں کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں اور ان حدبندیوں میں کسی قسم کی تبدیلی کو ظلم سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہی حدبندی ان کے لئے غربت کا قید خانہ بنی ہوئی ہے۔ ان دونوں برائیوں کا انسداد صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ زمین کے بارے میں ملکیت کے تصور کو چھوڑ کر متاع کے تصور کو اپنایا جائے اور اس تبدیلی کو لانے کا اسلامی طریقہ یہ ہے کہ آخرت کے حوالے سے ملکیت کی نفی کی جائے اور توحید کے حوالے سے پوری نوعِ انسانیت کو "دودۂ آدم کنفسٍ واحدہ" سمجھ کر ان کی ضرورتِ رزق کو پورا کرنے کی ذمہ داری کو قبول کیا جائے۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ ہمیں بتلاتی ہے کہ اس ذمہ داری کے پیشِ نظر لوگ کبھی خود اپنی زمینیں خلافت کے حوالے کر دیتے تھے اور کبھی خلافت ان سے لے لیتی تھی کیونکہ وہ زمین کے بارے میں "ایں متاع بندہ و ملک خدا است" کا نظریہ رکھتے تھے۔

تصورِ ملکیت اور متاع کا فرق

"ملکیت" اور "متاع" کے تصور میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ملکیت کا تصور ہمیں ایک جامد قسم کے فلسفہ میں الجھا دیتا ہے جب کہ "متاع" کے تصور سے ہمیں ایک محرک فلسفۂ حیات ملتا ہے۔ جس میں مطلوبہ اداراتی تبدیلیوں INSTITUTIONAL CHANGES کے لئے ہمیشہ گنجائش باقی رہتی ہے۔ چنانچہ اس تصور کو اپنی زرعی

پالیسی کی بنیاد بنا کر ہم نہ صرف اپنی فنی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی مشکلات دور کر سکتے ہیں بلکہ عصر جدید کے زرعی تقاضوں کو بآسانی اور بخوبی پورا کرنے کی واحد صورت بھی یہی ہے۔

متاع کا حرکی تصور ہمارے فکر و عمل کے لئے ایک وسیع دائرہ کھلا چھوڑتا ہے جس میں ہمیں اپنے نظریہ حیات کی روشنی میں خود اپنی راہ تلاش کرنی چاہیئے۔ دوسروں کی نقالی سے نتائج اچھے نہیں نکلیں گے۔

تراش از شیشہ خود جادۂ خویش

براہِ دیگراں رفتن عذاب است

کھیت ـــــ خودی کی تربیت گاہ

اسلامی نقطۂ نظر سے زرعی نظام کی تشکیل میں چند ایسے اصولوں پر ہی عمل پیرا ہونا کافی نہیں جن سے پیداوار میں اضافے کے اقتصادی تقاضے پورے ہوتے ہوں بلکہ ان اعلیٰ تر مقاصد اور انفرادی اقدار کو پیش نگاہ رکھنا بھی ضروری ہے۔ جو انسانی زندگی کی آخری غایت ہیں اور جو دوسرے ادیانِ عالم کے مقابلے میں دین اسلام کا مابہ الامتیاز ہیں۔ علامہ اقبال کے نزدیک دنیائے انسانیت کو اس زمانے میں تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں وہ رقمطراز ہیں:۔

"عالم انسانی کو آج تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ کائنات کی روحانی تعبیر، فرد کا روحانی استخلاص اور وہ بنیادی اصول جن کی نوعیت عالمگیر ہو اور جن سے انسانی معاشرے کا ارتقاء روحانی اساس پر ہوتا رہے"۔

اقتصادیات اور اخلاقیات

انسانی معاشرے کو روحانی اساس پر استوار کرنے کے ضمن میں وہ اقتصادی پالیسی کو اخلاقی مقاصد کے تابع رکھنے پر زور دیتے ہیں۔ "علم الاقتصاد" میں وہ لکھتے ہیں:۔

"انسان کے معمولی مقاصد کو سمجھنے کے لئے ان پر اخلاقی لحاظ سے نظر ڈالنی چاہیئے۔ مثلاً خوراک، لباس اور مکان ہماری زندگی کے لئے ضروری ہیں اور ان کی قدر ان مقاصد پر منحصر ہے جن کو یہ پورا کرتے ہیں۔

مگر زندگی کے ان معمولی مقاصد کی اصل وقعت صرف اس صورت میں معلوم ہو سکتی ہے جب ہم ان پر زندگی کے افضل ترین مقاصد کے لحاظ سے غور کریں۔ اس لئے علم الاقتصاد سمجھنے کے لئے کسی قدر مطالعہ اور علم اخلاق کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اکثر مصنفین نے اس صداقت کو محسوس نہیں کیا جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ دولت بلا لحاظ زندگی کے افضل ترین مقاصد کے بجائے خود ایک مقصد بن گئی جس سے بعض تمدنی اصلاحوں کے ظہور پذیر ہونے میں بے جا تعویق ہوئی اور دولت سے پیار کرنے والوں کی حرص و آز پہلے سے تیز ہو گئی"۔

آگے چل کر لکھتے ہیں :۔

موجودہ دَور کے محققین اقتصاد کا سب سے بڑا فرض اس بات کا علم حاصل کرنا ہے کہ دولت کے استعمال کے وہ کون کون سے طریق ہیں جن سے تمدن کا شیرازہ مضبوط ہوتا ہے۔ افراد قوم کی اخلاقی اور جسمانی حالت ترقی کرتی ہے اور بحیثیت مجموعی ملک کے سیاسی اور اقتصادی نظام تمام اجزا سے ہم آہنگ ہو کر قوم کی بہبودی کا باعث ہوتے ہیں۔ علیٰ ہٰذا القیاس یہ دریافت کرنا بھی ضروری ہے کہ صرف دولت کی کون کون سی صورتیں تمدنی اور اخلاقی لحاظ سے انسان کی فطرت پر بُرا اثر ڈالتی ہیں اور پیدائش دولت کے پیچیدہ اسباب کو پورا عمل کرنے سے روکتی ہیں"۔

غرض ان کے نزدیک اقتصادیات اور اخلاقیات ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ اگر ایک طرف وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اقتصادیات کو اخلاقیات کے تابع رکھنا ضروری ہے تو دوسری طرف اس بات کے بھی شدت سے قائل ہیں کہ اخلاقی تربیت کے بغیر اقتصادی ترقی کی جانب ایک قدم بھی نہیں اٹھایا جا سکتا۔ "ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر" میں فرماتے ہیں :۔

" اقتصادی مقابلے میں تربیت کے اخلاقی عنصر کی ضرورت کچھ کم نہیں پڑتی۔ اعتماد باہمی، دیانتداری پابندیٔ اوقات، تعاون وہ اخلاقی اوصاف ہیں جو مہارت فن کی برابر کی جوڑ ہیں۔ ہندوستان میں بہت کارخانے محض اس لئے نہ چل سکے کہ کارخانہ داروں کو ایک دوسرے پر بھروسہ تھا نہ اصول امداد باہمی رہنما تھا۔ اگر ہم اچھے کاریگر، اچھے دکاندار، اچھے اہل حرفہ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اچھے شہری پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیئے کہ انہیں اوّل پکا مسلمان بنائیں"۔

نصب العین کا تعین

علامہ اقبال کے ان خیالات کے پیشِ نظر کسی بھی قومی (بالخصوص اقتصادی) پالیسی کو وضع کرنے کے ضمن میں پہلے مدعا کا تعین ضروری ہے کیونکہ اس سے قوائے زندگی جمع ہو کر بقائے زندگی کا موجب بنتے ہیں اور یہ مدعا ہی ہے جو افرادِ قوم کی ہمت کو جوان بناتا ہے۔ "رموزِ بیخودی" میں آپ نے ایک باب کا عنوان یہ رکھا ہے:۔

"در معنی ایں کہ جمعیت حقیقی از محکم گرفتن نصب العین ملیہ و نصب العین اُمتِ محمدیہ حفظ و نشرِ توحید است"۔

اس کے مندرجہ ذیل اشعار خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں:۔

مدعا گردد اگر مہمیز ما ہم چو صرصر می رود شب دیز ما
مدعا رازِ بقائے زندگی جمع سیماب قوائے زندگی
چوں حیات از مقصدے محرم شود ضابطِ اسباب ایں عالم شود
مدعا مضرابِ سازِ ہمت است مرکزِ گو جاذب ہر قوت است

حفظ و نشرِ توحید

اور وہ مدعا کیا ہے؟ اقبال کے نزدیک یہ مدعا روحانی اساس پر انسانی معاشرے کا ارتقاء یا دوسرے الفاظ میں "حفظ و نشرِ توحید" ہے۔

تخمِ ایمان آخر اندر گل نشاند باز بانت کلمۂ توحید خواند
نقطۂ اُو را عالم لا الہ انتہائے کارِ عالم لا الہ
زاں کہ در تکبیر رازِ بودِ تُست
حفظ و نشر لا الہ مقصودِ تست

حفظ خودی

اور انفرادی سطح پر "خودی" انسانی زندگی کی سب سے بڑی قدر ہے جس کے لئے وہ "دل" یا کسان کو سمجھانے کے لئے "دانۂ دل" کی شاعرانہ ترکیب استعمال کرتے ہیں۔

اللہ تعالےٰ نے جہاں اپنی خلاقیت، ربوبیت اور رزاقیت کی تفہیم کے لئے زراعت سے بے شمار زرعی استعارے اور تشبیہات استعمال کرکے انسان کو زندگی کے اعلیٰ مقاصد کی طرف متوجہ فرمایا ہے وہاں دیہاتی آبادی کے بارے میں یہ اندیشہ بھی ظاہر فرمایا ہے کہ ان میں کفر و نفاق کی طرف مائل ہونے کے امکانات زیادہ ہیں۔

"یہ اعراب کفر و نفاق میں زیادہ سخت ہیں اور ان کے معاملے میں اس امر کے امکانات زیادہ ہیں کہ اس دین سے ناواقف رہیں جو اللہ نے اپنے رسول صلعم پر نازل کیا ہے۔" (سورۃ توبہ)

اس قرآنی حکمت کے پیش نظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زراعت کو "باعثِ ذلت" فرمایا تھا۔

حضرت ابو امامہ نے ایک جگہ ہل اور کھیتی کے آلات دیکھ کر فرمایا "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جس گھر میں یہ آلات داخل ہو جاتے ہیں اس گھر میں اللہ ذلت و مسکنت داخل کر دیتا ہے۔" (صحیح بخاری باب الزراعۃ)

مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی نے اپنی کتاب "اسلام کا اقتصادی نظام" میں اس حدیث کی توجیہہ کے سلسلے میں امام محمدؒ، امام سرخسیؒ، شاہ ولی اللہؒ، امام ابن حزمؒ، امام بخاریؒ، محدث داؤدیؒ اور محدث ابن تینؒ کی آراء بیان کی ہیں، جن میں مؤخر الذکر کے سوا تمام علما و فقہا اس بات پر متفق ہیں کہ اس حدیث سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے کہ آنحضرت علیہ وسلم نے بحیثیت پیشہ زراعت کی تنقیص فرمائی بلکہ آپ نے اس پیشے کے ان مضر نفسیاتی اثرات کو ذلت و رسوائی سے تعبیر فرمایا ہے جس کی وجہ سے وہ دین کے اعلیٰ مقاصد مثلاً "جہاد" (یعنی حفظ و نشرِ توحید) سے ہی غافل ہو جاتا ہے۔ کسان کی زندگی کے لیل و نہار بیلوں کی دم کے پیچھے پیچھے پھرنے، گوڈنے، پانی دینے، بیج بونے اور فصلوں کو نشو و نما دینے میں گزر جاتے ہیں جو بسا اوقات اس میں زمین پیوندی، رجعت پسندی، محدود مفادات، محدود وفاداریاں جیسے خصائل شنیعہ پیدا کر دیتی ہیں۔

"پنجاب کے دہقان سے خطاب" میں علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

بتا کیا تیری زندگی کا ہے راز
ہزاروں برس سے ہے تو خاک باز
اس خاک میں دب گئی تیری آگ
سحر کی اذان ہو گئی اب تو جاگ
بتانِ شعوب و قبائل کو توڑ
رسومِ کہن کے سلاسل کو توڑ
زمین میں ہے گو خاکیوں کی برات
نہیں اس اندھیرے میں آبِ حیات
زمانے میں جھوٹا ہے اس کا نگیں
جو اپنی خودی کو پرکھتا نہیں

چنانچہ کسان کو جو ایک دانہ بو کر صد ہزار دانے پیدا کرنے میں یقین رکھتا ہے یہ مشورہ دیتے ہیں کہ زندگی کا مقصد یہی نہیں کہ تم زمین ہی میں دانہ ڈالنے پر قانع ہو کر رہ جاؤ بلکہ خاکِ بدن میں بھی دانۂ دل اگانے کی فکر کرو۔

بخاکِ بدن دانۂ دل فشاں
کہ ایں دانہ دارد ز حاصل نشاں

"اقبال کے حضور" میں سید نذیر نیازی لکھتے ہیں کہ " زمین پیوستگی کے بجائے زمین وارستگی (اپنے تمام اخلاقی، روحانی، سیاسی، اجتماعی متضمنات کے ساتھ) حضرت علامہ کا خاص مضمون ہے چنانچہ حضرت علامہ انسان کے اس جذبے کو بہت اہمیت دیتے ہیں جو روح انسانی کو زمین سے رستگاری حاصل کرنے اور عالمِ بالا کی سیر کرنے پر اکساتا ہے۔ ان کے نزدیک زمین سے آزاد ہونا انسان کا بنیادی امتیازی وصف ہے اور انسان کو زمین سے آزاد ہونا چاہیئے۔

یہ جذبہ انسانی شخصیت کے ماورائی پہلو سے تعلق رکھتا ہے اور ذات باری تعالیٰ سے جو لامکان ہے تعلق بلکہ شدید محبت پیدا کر کے ہی تشفی پا سکتا ہے۔ چنانچہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک خودی کا سر نہاں لا الٰہ الا اللہ ہے۔ اس لئے حفظ خودی کا تقاضا بھی حفظ و نشر توحید ہی ہے جو امت محمدیہ کا نصب العین ہے۔ اس لئے علامہ اقبالؒ کسان کو خودی کی نگہبانی اور تربیت کا درس دیتے ہیں۔

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ تُو، کھیتی بھی تُو، باران بھی تُو، حاصل بھی تُو

ڈھونڈ کے اپنی خاک میں پایا جس نے اپنا آپ
اس بندے کی دہقانی پر سلطانی قربان

خودی کی نشو و نما عشق و محبت سے ہوتی ہے اور عشق و محبت کا محور و مقصد خدا کی ذات ہی کو ہونا چاہیئے کیونکہ خودی کی نشو و نما کے لامحدود امکانات اللہ کی محبت ہی سے اُجاگر ہوتے ہیں۔

نقطۂ نورے کہ نام او خودی است — زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است
از محبت می شود پائندہ تر — زندہ تر سوزندہ تر تابندہ تر

از محبت اشتعال جوہرش
ارتقائے ممکناتِ مضمرش

"دانۂ دل" کی اصلاح سے بھی علامہ اقبال کی مراد ایسی خودی ہے جو خدا کی محبت سے بالیدگی اور نشو و نما پائے۔ کاشتکار اپنے پیشے میں قدم قدم پر خدا کی صفات ربوبیت، خلاقیت اور رزاقیت کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔ کھیتی باڑی کے تمام کام اور کسان کی زندگی کے داخلی اور خارجی احوال اسے اپنے خدا کے ساتھ محبت کا رشتہ استوار کرنے کی تحریک کرتے رہتے ہیں۔

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون ؟ — کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار ؟ — خاک کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟

کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب ؟
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب ؟

غرض جب کسان یہ دیکھتا ہے کہ وہ خدا ہی کی ذات ہے جو بیج کو مٹی کی تاریکی میں پالتی، دریاؤں سے سحاب اٹھاتی، نورِ آفتاب سے فصلوں کی بالیدگی کا سامان کرتی، موسموں کو خوئے انقلاب سکھلاتی اور بالآخر خوشۂ گندم کی جیب کو موتیوں جیسے دانوں سے معمور کر دیتی ہے تو وہ اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ زمین اور یہ سب کچھ اللہ ہی کا ہے۔

دہ خدایا یہ زمین تیری نہیں تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں میری نہیں

چنانچہ اس بصیرت کی روشنی میں وہ زمین کے ساتھ خدا کے واسطے سے ایک نیا رشتہ دریافت

کرتا ہے اور اس پر منکشف ہو جاتا ہے کہ زمین کا حقیقی مالک نہ جاگیردار ہے نہ مزارع اور نہ ہی کاشتکار اور زمین کے ساتھ ساتھ انسان کے ان عارضی اور ناپائیدار رشتوں سے بلند تر ہو کر جب وہ الارض للہ کی حکیمانہ بصیرت حاصل کر لیتا ہے تو اسے اپنے لئے خلیفۃ الارض کا وہ مقام نظر آنے لگتا ہے۔ جہاں پہنچ کر رمز محبت میں وہ بکمالِ شوخی اپنے خدا سے کہہ سکتا ہے ؂

بیابان و کوہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم

اور جہاں زمین اسے یہ پکارتی ہوئی سنائی دیتی ہے ؂

یہ گنبدِ افلاک، یہ خاموش فضائیں | ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں | یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

انی جاعل فی الارض خلیفہ کی قرآنی بصیرت میں یہ حقیقت خود بخود منکشف ہو جاتی ہے کہ جہاں اس کرۂ ارض کی تمام مخلوقات کو محض تلاش کرنے پر ہی اپنا رزق مل جاتا ہے وہاں انسان پر اپنا رزق خود پیدا کرنے کی ذمہ داری ڈال دینے میں کیا حکمتِ خداوندی تھی؟ درحقیقت زمین پر انسان کو قادر و قابض بنانے کی یہی عملی صورت تھی جو ممکن ہو سکتی تھی۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو کسان کو اللہ تعالیٰ کے نظام ربوبیت یعنی انتظامِ رزق رسانی میں ایک نہایت ہی اہم مقام ملا ہے۔ جس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ تمام مخلوق کو کنبہ خدا سمجھتے ہوئے ان کی ضروریات رزق پیدا کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لے۔ لیکن جو کسان کھیت سے خود اپنا بھی رزق نہ حاصل کر سکتا ہو وہ بھلا اپنے منصب اور اپنی خودی کو کس طرح پہچان پائے گا۔ کھیت سے دہقان کو رزق نہ ملنے کی وجوہ خواہ کچھ بھی ہوں اور یہ وجوہ انفرادی بھی ہو سکتی ہیں اور معاشرتی بھی، معاشی بھی اور اخلاقی بھی، فنی اور تکنیکی بھی۔ اقبال کے نزدیک قابلِ صد نفرین ہیں جن پر خدا کا غضب نازل ہوتا ہے۔ چنانچہ "بال جبریل" میں خدا اپنے فرشتوں سے کہتا ہے۔

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

کسان کا مقدر تو یہ تھا کہ وہ اپنی خودی کو پرکھنے کا روحانی تجربہ حاصل کرتا، وہ تو اپنی روٹی بھی پیدا کرنے سے عاجز رہا، جسم و جان کے رشتے کو برقرار رکھنے کے چکر میں پھنسا رہا" کاد الفقر ان سے یکون کفرا" کے ارشاد نبویؐ کے مصداق خدا کی ربوبیت اور اپنی خودی سے ہی انکار کر بیٹھا۔ اس سے بڑا حادثہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ اس طرح جو کاشتکار زمین سے بھرپور اقتصادی نفع کماتا ہے، لیکن اپنے اس پیشے کو اپنی روحانی نشوونما کا سامان نہیں بناتا اس کے خائب و خاسر ہونے میں بھی کوئی شک نہیں۔

قرآن حکیم کا ارشاد ہے:۔

"جو شخص آخرت کی کھیتی کا طالب ہو اس کیلئے ہم اس کھیتی میں افزائش کریں گے اور جو دنیا کی کھیتی کا خواستگار ہو اس کو اس میں سے دیں گے اور اس کا آخرت میں کچھ حصہ نہ ہوگا۔"

(الشوریٰ)

روحانی اساس کی ضرورت

کاشت کاری کے کام میں روحانیت اور عظمت و تکریم پیدا کرنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ اس کو روحانی اساس مہیا کی جائے اور یہ صرف اسی وقت ممکن ہوگا جب اس کام کا رشتہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے جوڑا جائے گا۔ انسان کی روحانی نشوونما کے لئے لازم ہے کہ کاشتکار کی فکر کو ہمہ وقت بیدار رکھ کر خدا کی ذات کے ساتھ اس کا شعوری تعلق قائم رکھا جائے۔ یوں نہیں ہونا چاہیئے کہ محنت کش کاشت کار کی زندگی کے لمحات دو طرح کے خانوں میں بٹ جائیں جن میں کبھی تو وہ محو فکر ہو اور کبھی محو کار، اپنی محنت اور مشقت کے دوران کاشت کار خدا کے ساتھ اپنا شعوری تعلق کیوں کر قائم رکھ سکتا ہے۔ اس کی ایک نہایت عمدہ مثال سائمن ویل (SIMONE WEIL) نے دی ہے جسے یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ وہ رقمطراز ہے:۔

"اس میں شک نہیں کہ جب کوئی شخص مصروف کار ہوتا ہے تو اس وقت اس کی تمام توجہ اپنے کام پر ہی مرکوز ہوتی ہے۔ مثلاً جب کوئی (تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ) کاشت کار زمین میں بیج بکھیر رہا ہوتا ہے تو اگرچہ اس کے پیش نظر یہی ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ اچھی طرح بوائی کرے اور اس وقت وہ بیج کے بارے میں ان تمام سائنسی معلومات پر غور و خوض نہیں کر رہا ہوتا جو اس نے اپنی زرعی تعلیم کے دوران حاصل کی ہیں۔ تاہم اپنی جگہ پر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس وقت جو عمل اس کی توجہ کا مرکز بنا

ہؤا ہے وہ اس کی تمام فکر پر محیط ہے۔"

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک مسرور نوجوان بیاہتا عورت کو اپنے پہلے ہونے والے بچے کے لئے نہا لچے، سیلتے پروتے وقت یہی خیال دامن گیر ہوتا ہے کہ وہ اسے نہایت اچھی طرح سیئے لیکن اس عمل کے دوران وہ کبھی ایک لمحے کے لئے بھی اس خیال سے غافل نہیں ہوتی کہ اپنے پیٹ میں وہ ایک بچے کو اٹھائے ہوئے ہے۔ جسے جنم دے کر وہ ایک عظیم مسرت سے ہمکنار ہونے والی ہے فرض کیجئے کہ عین اس وقت کسی ملزمہ کو کبھی جیل میں نہالچے سینے پرونے کا کام ملا ہے اور وہ بھی سینے پرونے کے کام میں مگن ہے یقیناً اسے بھی یہ فکر دامن گیر ہے کہ وہ اسے اچھی طرح سیئے پروئے مگر اس کا یہ کام محض خوف کے زیر اثر ہوگا۔ اگرچہ ایک سطح بین انسان ان دونوں کے کام کو دیکھ کر یہی رائے قائم کرے گا کہ دونوں عورتیں ایک ہی وقت میں ایک ہی کام کو ایک ہی انہماک کے ساتھ انجام دے رہی ہیں، دونوں کو ایک ہی سے مسائل درپیش ہیں، لیکن درحقیقت ان دونوں کے کام میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔"

دورِ حاضرہ کا سب سے بڑا معاشرتی مسئلہ یہی ہے کہ محنت یا کام کو اس ناگواری کی انتہا سے اٹھا کر خوشگواری کی اس انتہا تک پہنچایا جائے تاکہ دورِ جدید کے انسان کی اس جذباتی ناآسودگی کو دور کیا جا سکے، جسے "بوریت" کا نام دیا جاتا ہے اور جس کے نتیجے میں وہ اپنے آپ کو اقتصادی نظام کا ایک بے جان پرزہ محسوس کرتا ہے۔

کام میں محنت، یکسوئی، لگن، انہماک اور دلچسپی پیدا کرنے کا طریقہ ایک ہی ہے جس کو ہمارے بعض صوفیاء نے حکیمانہ مقولہ "دست با کار دل با یار" (ہتھ کار وَل دل یار وَل) میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کر دیا ہے ؎

نمی گویم کہ از عالم جدا باش
بہر کارے کہ باشی با خدا باش

کام چاہے چھوٹا ہو یا بڑا، اس میں دنیا و آخرت دونوں کا حسن اس طرح جمع کر دینا چاہیئے کہ جس طرح بچے کو جنم دینے والی عورت کے نہالچے سینے کے عمل میں موجود ہوتا ہے۔ ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاخرۃ حسنۃ . . . .

اقبال کے نزدیک خودی کی نگہبانی ہی مقصدِ حیات ہے اس لئے وہ ہر کام یا پیشہ جو محض معاشی

تگ و دو یا تلاش رزق تک محدود ہو کر رہ جائے اور انسانی خودی کی پرورش نہ کر سکے، انسان کے شایانِ شان نہیں۔ خودی کی نگہبانی کے لئے وہ نان زہرِ ناب سے کم نہیں جو اس سے خدا کی محبت کی آب و تاب سلب کرے۔

اقبال کے نزدیک کاشتکار کے پیشہ خاکبازی میں اس کی خودی کی آگ دب گئی ہے اور خدا کے ساتھ اپنے تعلق کو بھول کر رسومِ کہن اور بتانِ شعوب و قبائل کا اسیر ہو کر رہ گیا ہے، جسے یہ بتانے کی سخت ضرورت ہے۔

یہی دین محکم، یہی فتح یاب
کہ دنیا میں توحید ہو بے حجاب

دنیا میں توحید کو بے حجاب کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ انسان اپنے آپ کو خدا کی محبت کے جذبے سے سرگرم عمل بنائے کیونکہ اس کے بغیر انسان کی خودی کی مثال ایک بانجھ دانے کی سی ہے جو بالیدگی اور نشوونما کی صلاحیتوں سے یکسر عاری ہے جب کہ انسانی زندگی کا حقیقی مقصد یہی ہے کہ اس سے خدا کی محبت کا بیج پھوٹے۔

از درونِ این گلے با حاصلے
بس غنیمت دان اگر روید دلے

ظاہر ہے کہ اقبال نے کاشتکار کے سامنے ایک ایسا ایمانی اور روحانی نصب العین رکھا ہے جس سے اس پر زندگی کے ہنگامے سہل ہو جاتے ہیں اور جس کے نتیجہ میں دینوی فارغ البالی اور خوشحالی کی راہیں خود بخود ہموار ہو جاتی ہیں۔

اگر نہ سہل ہوں تجھ پہ زمین کے ہنگامے
بری ہے مستی اندیشہ ہائے افلاکی

بقول مولانا صلاح الدین احمد اقبال اگرچہ غلبۂ ارضی کو خلافتِ الٰہیہ کا ایک ضروری جزو سمجھتا ہے اور زندگی سے قوت و حرارت ہی مراد لیتا ہے لیکن ان کو وہ مقاصد کا درجہ نہیں دیتا بلکہ وسائل تک ہی محدود رکھتا ہے۔ دُنیا اور اس کی نعمتوں کو مردِ مومن کی میراث سمجھتا ہے۔ لیکن اسے اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنی مادی فتوحات میں ہی گم ہو کر رہ جائے اور اس رشتۂ بے نام کو ہاتھ سے چھوڑ

دے جو اسے کائنات کی اعلیٰ قدروں سے وابستہ کرتا اور ضمیر کائنات کا ہمنوا بناتا ہے۔ علامہ اقبال کی پیش کردہ قدریں زمانے کی کروٹوں سے بدلتی نہیں بلکہ دورِ ایام پر خندہ زن رہتی ہیں اور نہ زمانہ اپنے آپ کو ان کے مطابق ڈھالتا اور درست کرتا چلا جاتا ہے۔

علامہ اقبال کا نظریۂ خودی اور زمین کے بارے میں ان کے تصورات زراعت کے پیشے کے لئے جو فلسفیانہ بنیادیں مہیا کرتے ہیں ان میں دہقان کی معاشی ترقی ہی نہیں بلکہ اس کی روحانی ترقی کی بھی ضمانت ملتی ہے اور ایک قومی نصب العین بھی نکھر کر سامنے آ جاتا ہے۔ اس لئے علامہ اقبال کے یہ نظریات ہماری زرعی توسیع کے لئے فلسفیانہ اساس فراہم کرتے ہیں، جسے ہمارے توسیعی کارکنوں کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ علامہ اقبال کے نزدیک کھیت صرف زرعی پیداوار حاصل کرنے کا ہی ذریعہ نہیں بلکہ انسانی خودی کا تربیت کا میدان ہے۔ جہاں انسانی خودی خدا کی محبت اپنی تخلیقی جدت آفرینی اور جوشِ عمل کو بروئے کار لا کر تربیت یافتہ مستحکم اور مضبوط ہو جاتی ہے۔ غرض کھیت کی پیداوار بڑھانے اور اس سے زیادہ نفع کمانے کے لئے محنت و مشقت محض ایک اقتصادی عمل ہی نہیں بلکہ خودی کی تربیت و تکمیل کا ایک اہم ذریعہ ہے تاکہ ہمارے کاشت کاروں کے دلوں میں مقصدِ حیات کا وہ اعلیٰ و ارفع مفہوم جو درسِ خودی سے عبارت ہے از سرِ نو تازہ ہو سکے جس کی رو سے فرد کی حیثیت ملک کے اقتصادی نظام میں محض ایک بے جان پرزہ کی نہیں بلکہ اس کی ذات ایک منفرد شخصیت کی حامل ہے۔ کسان کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی شخصیت کی تکمیل کے لئے جد و جہد جاری رکھے نہ یہ کہ مادی اور معاشی تگ و دو میں اس قدر کھو جائے کہ اسے اپنے وجود کا احساس ہی نہ رہے۔

فکرِ اقبال کی اہمیت

زرعی عمل کی روز افزوں پیچیدگیاں بے شمار عوامل کی اصلاح کی متقضی ہیں لیکن ان تمام عوامل میں اصلاحات اس وقت تک نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکتیں جب تک کہ خود کاشت کار کے اندر ارادہ، قوتِ محرکہ، عزم اور ولولہ پیدا نہ ہو۔ ان اوصاف کو پیدا کرنے کے لئے اب تک زرعی ترقی کے تحریک کے لئے صرف معاشی محرکات کو ہی کافی

مدد مل سکتی ہے۔ لیکن ان معاشی محرکات کے ساتھ ساتھ اگر نظریاتی محرکات سے بھی کام لیا جائے تو اس سے زمینداروں میں امداد باہمی کی ذہنی فضا تیار کرنے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔ نیز لوگوں کے سامنے ایک ایسا اعلیٰ نصب العین بھی رکھا جا سکتا ہے جس سے یہ اوصاف شدت سے ابھریں تاکہ زرعی ترقی کے ساتھ ساتھ قومی سالمیت کا مقصد بھی پورا ہوتا رہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو علامہ اقبال کی تعلیمات بہت اہمیت کی حامل ہیں۔

اگرچہ علاّمہ اقبال کے پاس اپنے نظریات کو عملی جامہ پہنانے کی قوت نافذہ نہیں تھی تاہم جس حد تک وہ اپنے مخصوص حالات میں کاشتکار کی معاشی زبوں حالی کو دُور کرنے کی کوشش کر سکتے تھے، انہوں نے کی۔ پنجاب لیجسلیٹیو اسمبلی کے رکن کی حیثیت سے آپ نے ضروری اصلاحات کے لئے جدوجہد کی، جس کا تذکرہ اس کتاب میں پہلے آچکا ہے۔ لیکن ان کا اصلی کارنامہ فکری ہے۔ اور یہ ایک ایسا مہتم بالشان کارنامہ ہے کہ ان کے نظریات زرعی شعبے میں بہتر اور مطلوبہ نتائج پیدا کرنے میں آج بھی ہمارے لئے بے حد مفید اور قابلِ عمل ثابت ہو سکتے ہیں۔ زمین کے بارے میں "متاع" کا قرآنی تصور زرعی قیود کو توڑنے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتا ہے اور کسان کو درسِ خودی دے کر اسے زندگی کے بلند تر مقاصد کے لئے جدوجہد کرنے کا ولولہ بخشتا ہے اور سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ نظریات ہمارے نظریۂ حیات سے پھوٹتے ہیں۔ علامہ اقبال اس دور کے پہلے مفکر ہیں جنہوں نے زراعت کے شعبے پر اسلامی نقطۂ نظر سے غور و فکر کیا۔ ان کے نتائج فکر زرعی منصوبہ اور زرعی توسیع کے لئے اساس کا کام دے سکتے ہیں۔ اس کے لئے ہمیں ان کا ممنون ہونا چاہیئے کہ انہوں نے ہمیں زراعت کے موضوع پر ایسے فکر انگیز اور ولولہ افریں خیالات دیئے۔ ایک مفکّر کا قول ہے کہ قومیں اپنے کارناموں سے زیادہ اپنے افکار کے بل بوتے پر زندہ رہتی ہیں۔ علاّمہ اقبالؒ کا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے قوم کو حیات آفریں افکار ہی نہیں دیئے بلکہ قوم کے مخصوص شعبوں پر غور و فکر کر کے قومی فلاح و بہبود کی نئی راہیں سجھائیں۔ ان میں سے زرعی شعبے میں بہتر اور مطلوبہ نتائج پیدا کرنے کے لئے اقبال کے نظریات ہمارے لئے بے حد مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

اگر ہم دنیا کی مختلف ممالک کی زرعی ترقی کا جائزہ لیں تو ہر ملک کے زرعی انقلاب کے پیچھے ہمیں کوئی نہ کوئی دانشور ضرور نظر آتا ہے۔ جس کی تحریروں نے لوگوں کے لئے ایک نئی امنگ اور کام کرنے کے لئے نیا جوش و جذبہ عطا کیا۔ مثلاً امریکہ کی زرعی ترقی میں جیفرسن کے افکار جسے زرعی اعتقادیت (AGRICUL-TURAL FUNDAMENTALISM) کا نام دیا جاتا ہے، بہت اہمیت کے حامل ہیں۔

جاپان میں میجی دَور میں مختلف دانشوروں نے زراعت کے میدان میں ایک تحریک پیدا کی میکس ویور کیتھ بوڈلنگ اور دوسرے مصنّفوں نے لکھا ہے کہ امریکہ اور یورپ کی پوری اقتصادی ترقی کے پیچھے مارٹن لوتھر، ویلبر فورس، کلارکسن ، لارڈ شیفٹسبری جیسے مفکرین کے افکار کا بڑا ہاتھ ہے۔

ہمیں علامہ اقبال نے اپنے افکار میں زمین کے متاع ہونے کا جو قرآنی تصور دیا ہے وہ زراعت کو ایک طویل المدت منصوبے کے تحت ترقی دینے کے لئے بے حد مفید ہے۔ سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ اقبال اس شعبے میں ایسی تبدیلی لانا چاہتے ہیں جو ہمارے نظریات کے عین مطابق ہے۔ جہاں تک موجودہ زمانے میں اس تصور کو عملی جامہ پہنانے کا تعلق ہے اس کی عملی شکل امداد باہمی کی صورت ہے۔ امداد باہمی پر سب سے بڑا اعتراض یہی کیا جاتا ہے کہ ملکیت کے بارے میں ہمارے زمیندار اور کسان قطعی طور پر انفرادیت پسند ہیں اور وہ امداد باہمی کے اصولوں کو اپنانے کے لئے تیار نہیں ہوتے، یہ کہہ کر ہی مایوس ہو جانا غلط ہے۔ کیا اس سلسلہ میں ہمیں اسلام اور قرآن حکیم کے دیئے ہوئے عمرانی اور معاشی تصورات سے کوئی راہنمائی نہیں مل سکتی ؟ علامہ اقبال نے اس ضمن میں بھی قابل عمل افکار عطا کیے ہیں ۔

اگر تاریخ کے اوراق پر نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ دنیا کے مختلف ممالک میں امداد باہمی کی تحریکوں کے پیچھے وہاں کے مفکرین کا بڑا ہاتھ تھا۔ بلغاریہ میں ۱۹۰۶ء میں امداد باہمی کی جو نظریاتی تحریکیں اٹھیں ان کے پس پشت ٹالسٹائی اور ہنری جارج کی فکر کار فرما تھی۔ اسی طرح ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور کینیڈا میں اتحاد اور بھائی چارے کی جس تحریک نے جنم لیا وہ قدیم عیسائیت کے نظریات کا شاخسانہ تھی۔ علاوہ ازیں آئرلینڈ میں ۱۸۳۰ء میں جب اگریکلچرل پروڈکشن کوآپریٹو ——————

(AGRICULTURAL PRODUCTION CO-OPERATIVE) کی بنیاد پڑی، وہ وہاں کے مفکر اوون (OWEN) کے افکار کا نتیجہ تھی۔ جب تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ دنیا کے مختلف ممالک میں وہاں کے مفکرین کے خیالات مختلف اجتماعی اور امداد باہمی کی تحریکوں کو جنم دے سکتے ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہمارا ملک جہاں دین اسلام کی لازوال فکری و روحانی قوت موجود ہے اور علامہ اقبال جیسے دانشور کے افکار زندہ موجود ہیں قوم کے اندر امداد باہمی کے اصولوں پر زراعت کو منظم کرنے کی کوئی تحریک نہ اٹھائی جا سکے۔